



خطبات: حیدرآباد

۱۴۲۱ھ — ۶۲۰۰۰

صلی اللہ علیہ وسلم

نبی رحمت: پیامِ رحمت

مفتی قاضی فیض الرحمن جلال عثمانی

دارالعلوم سبیلِ السلام کے زیرِ اہتمام
ستہ نبویؐ پر دینے گئے خطبات کا مجموعہ

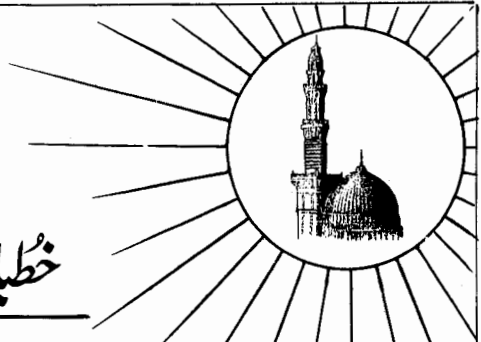
دارالعلوم سبیلِ السلام حیدرآباد۔ الہند

11 July 2002



خطباتِ حیدرآباد

۱۴۲۱ھ — ۶۲۰۰۰



نبی رحمتؐ کا پیامِ رحمتؐ

مفتی قاضی الرحمن جلال عثمانی

دارالعلوم سبیل السلام کے زیر اہتمام
شیخ نبویؒ پر دیئے گئے خطبات کا مجموعہ



دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد۔ الہند

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ



جملہ حقوق محفوظ

خطبات حیدرآباد۔ ۱۴۲۱ھ م ۲۰۰۰ء

کتاب	:	نبی رحمت کا پیام رحمت (رسالة الرّحمة من نبی الرّحمة ﷺ)
مؤلف	:	مولانا مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی
کمپوزنگ	:	مولانا محمد احسان اللہ سیلی -
طبع اول	:	شعبہ کمپیوٹر دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد
تعداد	:	ربیع الاول ۱۴۲۳ھ، جون ۲۰۰۲ء
قیمت	:	دو ہزار

ناشر

دارالعلوم سبیل السلام

مدینۃ العلم، حیدرآباد (الہند)

DARUL ULOOM SABEELUSSALAM

MADINATUL ILM, HYDERABAD. 500005

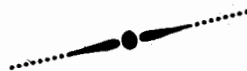
Tel : 4440450

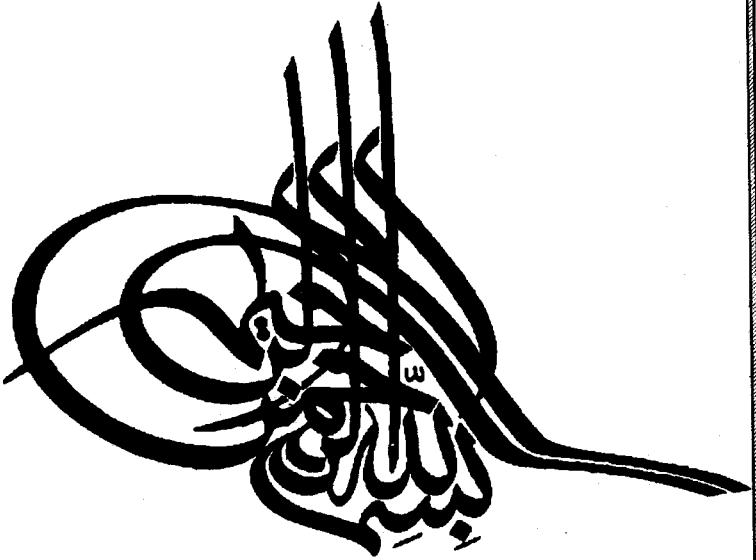
Fax : 4441835

Email : mrqasmi@hotmail.com

فہرست عناوین

۵	حمد و سلام.	*
۶	وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا.	*
۷	نگاہ اولیں.	*
۱۳	حرف و حکایت.	*
۱۷	تمہید:- تین بنیادی باتیں.	*
۳۲	رسالت.	*
۳۳	مکمل رسالت.	*
۳۶	و ما ارسلناک إلا رحمة للعالمین.	*
۳۹	پہلا خطبہ:- نبی رحمت ﷺ — عالم انسانیت کی سب سے بڑی ضرورت.	
۵۵	دوسرا خطبہ:- نبی رحمت ﷺ — کیا ان کے بغیر انسانیت منزل نجات پاسکتی ہے	
۷۳	رتیسرا خطبہ:- نبی رحمت ﷺ کی تعلیم و تربیت میں توازن اور حسن اعتدال.	
۸۷	چوتھا خطبہ:- نبی رحمت ﷺ کے پیام میں دلسوزی، دردمندی، عالم انسانیت کی ہمدردی.	
۱۰۷	پانچواں خطبہ:- نبی رحمت ﷺ کا پیام، کامل اور دائمی پیام.	





حم وشنا

صرف اس ذات بے ہمتا کو سمجھتی ہے جس نے اس
کارخانہ عالم کی ہر شے کو عدم کی اندھیرائیوں سے نکال کر
وجود کی جلوہ گاہ میں لاکھڑا کیا، — رنگ و بو کی اس
کائنات کا ہر ذرہ پُکار پُکار کر کہہ رہا ہے کہ
وہ ہے اور ایک ہے ۛ

اس آئینہ خانے میں سبھی عکس ہیں تیرے
اس آئینہ خانے میں تو کیجیگا ہی ہے گا

درود و سلام

اُس کے آخری پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) پر جنھوں نے
ظلم و جہالت میں بھیجی ہوئی انسانیت کو رشد و ہدایت
کا راستہ دکھایا۔ جنھوں نے باطل کی گھٹا ٹوپ تارکیوں
میں حق کی پر نور مشعلیں روشن فرمائیں اور دنیا کے
ظلمت کدوں میں اُجالا کر دیا ۛ

پھونانا جو سیدۂ شبِ تارا کیستے
اُس نورِ ازل کیس کا اُجالا نہیں لیتا

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
 مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا وہ اپنے پرانے کا غم کھانے والا
 فقیروں کا بلجا، ضعیفوں کا ماوی
 یتیموں کا والی، غلاموں کا مولی
 خطا کار سے در گذر کرنے والا بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
 مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
 اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
 اور اک نچوئے کیا ساتھ لایا
 مسکن خام کو جس نے کندن بنایا خالص سونگھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
 عرب جس پہ قرونوں سے قماہل چھایا پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا
 رہا ڈر نہ بیڑے کو موج بلاکا
 ادھر سے ادھر پھر گیا رخ ہوا کا

(مولانا الطاف حسین حالی)



نگاہِ اولین

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے نبی آئے، وہ سب ایک زمانہ، ایک دور، ایک حلقہ اور ایک علاقے کے لئے آئے۔ نبوت کے اس ”ربانی تسلسل“ میں کوئی نبی اپنے زمانہ سے قیامت کے قائم ہونے تک، اور دنیا کے ہر گوشہ اور ہر خطہ کے لئے آیا، تو وہ وہی ہے جسے لوگ ”محمد“ (ﷺ) کہتے ہیں۔ درود ہوان پر، سلام ہوان پر۔ گویا آپ ﷺ کی نبوت ہمہ گیر اور عالمگیر ہے، اور زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہے۔ دوسری جانب بھی توجہ دیجئے کہ حضرت آدم علیہ السلام ”صفی اللہ“ سے مشہور ہوئے، حضرت نوح علیہ السلام ”نجی اللہ“ کہلائے، حضرت ابراہیم علیہ السلام ”خلیل اللہ“ سے پہچانے گئے، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شہرت ”ذبیح اللہ“ سے ہوئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ”کلیم اللہ“ کا خطاب ملا، حضرت داؤد علیہ السلام ”خلیفۃ اللہ“ سے پکارے گئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ”روح اللہ“ سے موسوم ہوئے۔ ان سب کے بعد آخری نبی ﷺ کو آخری لقب بارگاہِ قدوس سے جو عطا ہوا، وہ اپنی جامعیت اور معنویت کے لحاظ سے سب سے علاحدہ اور جداگانہ ہے، یعنی آپ کو ”رحمۃ للعالمین“ کا لقب ملا۔ سورۃ الانبیاء کی تلاوت کرتے ہوئے جب آپ آخری حصہ پرائیں گے، تو یہ آیت ”وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ“ (۱۰۷) آپ کی توجہ کا مرکز، نظر کا نور اور دل و دماغ کے لئے سرور ثابت ہوگی۔ ترجمہ یہ ہے: ”اور اے پیغمبر! ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر اس لئے کہ پوری کائنات کے لئے رحمت کا ظہور ہو“ یا یہ کہ ”اور (اے محمدؐ) ہم نے آپ کو سارے جہاں والوں کے لئے پیکر رحمت بنا کر بھیجا ہے۔“ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے عام طور پر مفسرین نے لکھا ہے کہ قرآن مجید

نے جگہ جگہ آنحضرت ﷺ کے اوصاف بیان کئے ہیں، جن سے آپ کی پیغمبرانہ شخصیت نمایاں ہوتی ہے۔ لیکن اس آیت میں جو وصف بیان کیا گیا ہے، وہ نہایت جامع اور بڑا معنی خیز ہے۔ مختصر طور پر یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ ”رب العالمین“ ہے اور اللہ کے حبیب ”رحمۃ للعالمین“ ہیں۔ آپ کا ظہور کسی ایک ملک، کسی ایک قوم اور کسی ایک نسل کے لئے نہیں، بلکہ سارے جہان والوں کے لئے رحمت کا ظہور ہے۔ اپنوں کے لئے تو آپ رؤف و رحیم ہیں، لیکن غیروں اور جانی دشمنوں پر بھی آپ ﷺ کی رحمت کا سایہ پڑ رہا ہے۔ آپ کے پیغام کے طفیل سے انسانی عظمت، مساوات، جمہوریت، علم کی عام اشاعت وغیرہ جیسی نعمتیں روئے زمین پر عام ہوئیں اور انسانیت کے لئے ترقی کی نئی راہیں کھلیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ رحمۃ للعالمین ہی کا صدقہ ہے کہ لوگ گمراہیوں اور بد اعمالیوں میں مبتلا ہیں، پھر بھی انہیں عام عذاب سے ہلاک نہیں کیا جاتا، بلکہ توبہ کرنے اور درست ہونے کی مہلت دی جا رہی ہے۔ ایک حقیقت پسند شاعر کے بقول:-

خلق تو جرم کرے اور خدا فضل کرے حق تو یہ ہے کہ یہ خاطر ہے تمہاری ساری

جہاں تک تعلق لفظ ”رحمت“ کا ہے، تو اسے اہل لغت نے رقت اور احسان و مہربانی کا مجموعہ قرار دیا ہے۔ اس لفظ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف قرآن مجید میں بیشتر مقامات پر کی گئی ہے، اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کا احسان اور مہربانی ہے۔ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کی ”صفت رحمت“ میں ”رقت“ نہیں ہو سکتی، البتہ انسان میں رقت ہو سکتی ہے، تاہم ایسے انسان بھی ملتے ہیں کہ ان میں رقت تو ہوتی ہے، لیکن احسانی صفت سے وہ محروم ہوتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کو رحمت کے دونوں مفہوم سے نوازا ہے۔ ”عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ“ (التوبہ: ۱۲۸) جس سے تمہیں تکلیف ہوتی ہے، وہ چیز میرے محبوب کو بڑی شاق گزرتی ہے) میں رقت کا اور ”بِالْمُسْمُوْنِيْنَ رَوْفٌ رَّحِيْمٌ“ (التوبہ: ۱۲۸) اور مومنین پر مہربان اور شفیق ہیں) میں احسانی شان کا اظہار ہے، یعنی ہر درد مند کے درد کا احساس بھی ہے اور ہر درد کا درماں بھی۔ کسی غم زدہ اور دکھ درد کے مارے کو دیکھ کر غایت رافت سے آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں نوک مرغان پر دُرّ یتیم سے ارجمند تر اور تابندہ تر آنسوؤں کے موتی سراپا التجا بن کر بارگاہ رب العالمین میں گرتے ہیں، تو مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں اور غم و اندوہ کی کالی گھٹائیں کا فور ہو جاتی ہیں۔

اگر آپ دین و شریعت کے مکمل نظام پر غور کریں گے اور آنحضرت ﷺ کے اقوال، افعال

اور اعمال پر نگاہ ڈالیں گے، تو ہر جگہ ”رحمت“ کا پرتو آپ کو نظر آئے گا اور یہ معلوم ہوگا کہ آپ ﷺ کی رحمت کا دائرہ کس قدر وسیع اور تمام ہے۔ آپ ﷺ سے متعلق بے شمار واقعات ثابت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کی رحمت و شفقت اور آپ کے احسان و کرم سے دوست و دشمن، قوی و کمزور، آزاد و غلام، مرد و عورت، بوڑھے و بچے، چرند پرند، کیڑے مکوڑے اور جانور تک فیضیاب ہوئے۔ آپ ﷺ کا دل اسی رحمت کے جذبہ سے معمور تھا، اس کے نتیجہ میں آپ کے چہرہ پر مسرت کی لہریں دوڑنے لگتی تھیں، آپ کی آنکھوں سے آنسو کے قطرات بھی ٹپکنے لگتے تھے، آپ کے ہاتھوں میں جود و کرم کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ یہی وسیع ترین رحمت آنحضرت ﷺ کے ظاہر و روشن صفات میں سے ہے، جو اپنی جانب تمام مشاہیر اور بہادروں کو کھینچتی رہے گی، اور یہ بہادر جذبہ رحمت میں آپ سے سبقت لے جانا چاہیں گے، لیکن ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکیں گے، اور آنحضرت ﷺ اس صفت میں تنہا تمام کے پیشوا اور قائد اعظم تسلیم کئے جائیں گے، بلکہ کئے جا چکے ہیں۔ رحمۃ للعالمین کی ”شان رحمت“ کی یہی وہ ہمہ گیر عظمت و وسعت ہے، جس سے متاثر ہو کر آنجہانی پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری نے کہا ہے:-

انوار بے شمار محدود نہیں رحمت کی شاہراہ مسدود نہیں
معلوم ہے کچھ تمہیں محمدؐ کا مقام وہ امت اسلام میں محدود نہیں

رحمت و شفقت اور ہمدردی و رحمہ کی بارے میں آپ ﷺ کے یہ ارشادات بھی ہیں۔

”جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ بھی اس پر رحم نہیں فرماتا“ (بخاری)۔ ”خدا کی مخلوق اس کا کنبہ ہے، خدا کو وہ شخص سب سے زیادہ محبوب ہے، جو اس کے کنبہ کے ساتھ حسن سلوک کرے“ (بیہقی)۔ ”انسانوں کے ساتھ رحم کرنے والوں پر رحم بھی کرتا ہے، لہذا زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا“ (ابوداؤد)۔ ”رحم اور ہمدردی تو اس شخص کے سینہ سے نکال دی جاتی ہے جو بد بخت ہے،“ (ترمذی)

آنحضرت ﷺ نے اپنی ”شان رحمت“ کے بارے میں خود ارشاد فرمایا ہے ”میں وہ رحمت ہوں، جسے اللہ نے اپنی مخلوق کو بطور تحفہ عطا فرمایا ہے۔“ ایک مرتبہ اہل کفر کے لئے جب بددعا کرنے کی التجا کی گئی، تو آپؐ نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ نے مجھے عذاب بنا کر نہیں بھیجا ہے، بلکہ سراپا رحمت بنا کر مبعوث فرمایا ہے۔“

سچ ہے اور دنیا کی یہ بہت بڑی حقیقت ہے کہ رحمۃ للعالمین ﷺ کی ”رحمت عامہ“ کی برکتوں سے عقل بھی بہرہ ور ہے اور دل کی دنیا بھی شاد کام ہے۔ اس پس منظر میں شاعر مشرق ڈاکٹر محمد اقبالؒ کا یہ شعر کس قدر معنی خیز اور حقیقت افروز ہے:-

تیری نگاہ ناز سے دونوں مراد پا گئے عقل غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب

شوکت سحر و سلیم تیرے جلال کی نمود فقر و حنید و پایید، تیرا جمال بے نقاب

اس وقت آپ کے ہاتھ میں جو کتاب ہے، وہ اسی موضوع سے متعلق ہے۔ راقم الحروف نے ”خطبات حیدر آباد“ کے دوسرے تسلسل کے ضمن میں ملک کے مشہور عالم اور نامور صاحب قلم مفتی پنجاب حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی مدظلہ (شیخ الجامعہ، جامعہ دار السلام، البیروت) سے موجودہ ملکی اور عالمی حالات کے تناظر میں ”نبی رحمت ﷺ کا پیام رحمت“ کے عنوان سے پانچ روزہ خطبات کی گزارش کی تھی۔ مفتی صاحب نے میری اس گزارش کو ازراہ عنایت قبول فرمایا، ۱۵/۵/۹۲ء رجب ۱۴۱۲ھ مطابق ۲۸/۴/۸۲ء (چهارشنبه تا یکشنبه) پانچ خطبات دیئے۔ ابتدائی چار دنوں میں یہ خطبات اندر پر یہ درشنی ہال، باغ عامہ، ناپلی، حیدرآباد میں دیئے گئے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت حضرت مولانا محمد اسلم قاسمی دامت برکاتہم (صاحبزادہ محترم حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند) نے کی۔ آخری خطبہ مفتی صاحب نے اس سلسلہ کے اختتامی اجلاس کی مناسبت سے ”دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد“ میں دیا۔ مولانا محمد برکت اللہ قاسمی مدظلہ (صدر مدرس) نے مؤثر انداز میں تعارفی اور خیر مقدمی تقریر کی۔ اس موقع پر ”تنظیم اہلنائے قدیم دارالعلوم دیوبند“ کے اہم ذمہ داران اور اس تنظیم سے وابستہ قریبی رفقاء و اراکین شریک تھے، جن میں مولانا محمد افضال الحق قاسمی، مولانا عمید الزماں کیرانوی، مولانا احمد علی قاسمی، ڈاکٹر زین الساجدین قاسمی، مولانا مزمل الحق قاسمی، مولانا خلیل الرحمن راز، مولانا عطاء الرحمن قاسمی اور مولانا وارث مظہری کے اسماء قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بعض حضرات نے اپنے خیالات و تاثرات کا بھی اظہار فرمایا اور دارالعلوم سبیل السلام کے زیر اہتمام ”خطبات حیدرآباد“ کے اس سلسلہ کو مفید اور نفع بخش قرار دیا۔

صاحب خطبات مولانا مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی نے اپنے ضروری اور فکر انگیز تمہیدی کلمات کے علاوہ مستقل طور پر درج ذیل پانچ عنوانات پر خطبات دیئے:-

پہلا خطبہ:- نبی رحمت ﷺ — عالم انسانیت کی سب سے بڑی ضرورت۔

دوسرا خطبہ:- نبی رحمت ﷺ — کیا ان کے بغیر انسانیت منزلِ نجات پا سکتی ہے۔
 تیسرا خطبہ:- نبی رحمت ﷺ کی تعلیم و تربیت میں توازن اور حسنِ اعتدال۔
 چوتھا خطبہ:- نبی رحمت ﷺ کے پیام میں دلسوزی، دردمندی، عالمِ انسانیت کی ہمدردی۔
 پانچواں خطبہ:- نبی رحمت ﷺ کا پیام، کامل اور دائمی پیام۔

مفتی صاحب کے یہ تمام خطبات بصیرت افروز اور چشم کشا تھے، ہر خطبہ میں اہل علم اور باشعور شرکاء (جن میں مرد کے ساتھ خواتین بھی تھیں اور بعض غیر مسلم بھی) کی کثیر تعداد شریک رہی۔ ہر روز کے خطبہ کے اہم اقتباسات حیدرآباد کے مشہور اخبارات (سیاست، منصف، رہنمائے دکن، عوام) میں شائع ہوتے رہے۔ بعض انگریزی اخبارات میں بھی خطبات کے اہم حصے شائع ہوئے، مقامی ٹی وی چینل پر بھی خطبات کے پروگرام پیش کئے جاتے رہے۔ اس طرح ان خطبات کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے اور اس کی افادیت اور نافعیت کے دائرے کو عام اور وسیع سے وسیع تر کرنے کی کوشش کی گئی، اب الحمد للہ ان قیمتی خطبات کا قابلِ قدر مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

صاحب خطبات مولانا مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی علمی، قلمی اور تصنیفی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں۔ مفتی صاحب، تفسیر و حدیث، اور فقہ و سیرت کے موضوع پر متعدد و قیچ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کتابوں میں ایک اہم کتاب ”معمارِ انسانیت“ (صفحات ۴۶۴) بھی ہے جو انسانِ کامل، سید الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ اور پیغامِ انقلابِ آفریں پر مشتمل ہے۔ دیگر علوم و فنون میں بھی لکھی ہوئی ان کی کئی کتابیں ہیں، ان کی نگرانی میں ماہنامہ ”دار السلام“ جو شائع ہوتا ہے، اس میں ہر ماہ دل کو چھو لینے والے ان کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ان کی تحریریں شستہ، شگفتہ اور برجستہ ہوتی ہیں۔ وہ اپنی ان خصوصیات، علمی کارناموں، مسلسل جدوجہد اور طبیعت کی شرافت کی وجہ سے اہل علم کی بزم میں قدرو منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، مولانا ہلال عثمانی دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مفتی، مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمن عثمانی، مفسر قرآن و متکلم اسلام مولانا شبیر احمد عثمانی، مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی (بانی و ناظم ندوۃ المصنفین دہلی) جیسے اہل علم و تحقیق و اصحابِ فضل و کمال سے خاندانی اور علمی نسبت بھی رکھتے ہیں۔ ہم اس پس منظر میں محترم مولانا ہلال عثمانی کے ”خطبات سیرت“ کے اس مجموعہ کو قارئین کی خدمت میں پیش کرتے

ہوئے بے پایاں مسرت محسوس کر رہے ہیں، اور امید کرتے ہیں کہ حضرت مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی مدظلہ کے مجموعہ خطبات کی طرح یہ مجموعہ بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا اور شوق کے ہاتھوں لیا جائے گا۔

پہلے ”خطبات حیدرآباد“ ہی کی طرح دوسرے ”خطبات حیدرآباد“ کی تیاری کے تمام کاموں میں عزیز مکرم مولانا احمد عبدالحجیب قاسمی ندوی میرے معاون رہے۔ زیرِ نظر مجموعہ کی ترتیب اور اشاعت میں مولانا عبدالباسط ندوی نے پوری مستعدی کے ساتھ خصوصی دلچسپی لی۔ ان کے اس کام میں مفتی محمد برکت اللہ قاسمی، مولانا خورشید انور ندوی، مدنی اور مفتی گلگیر احمد قاسمی نے اعانت کی۔ مولانا محمد احسان اللہ سمیلی نے کمپیوٹر کتابت کے فریضہ کو حسن و خوبی اور اہتمام کے ساتھ انجام دیا۔ مولانا محمد یوسف جاوید بھی مختلف مرحلوں پر کام آتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے، اور یہ کتاب شرف قبول حاصل کرے۔

محمد رضوان القاسمی

(محمد رضوان القاسمی)

ناظم

دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد

۲۳ ربیع الاول ۱۴۲۳ھ

۱۵ جون ۲۰۰۲ء۔ چار شنبہ

حرف و حکایت

الحمد لله رب العالمین ، الرحمن الرحیم ، مالک يوم الدين ، و صلاة الله و
سلامه و رحماته و بركاته على صفوة عبادہ ، و خیرته من خلقه محمد عبده و
رسوله ، و على اهل بيته الطاهرين و صحابته اجمعين ، و من تبعهم باحسان إلى
يوم الدين .

دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد ایک معروف علمی اور دینی ادارہ ہے ، جس کے بانی اور
ناظم اعلیٰ دار العلوم دیوبند کے ایک ممتاز فاضل مولانا محمد رضوان القاسمی ہیں۔
مولانا نے دار العلوم سبیل السلام کے زیر اہتمام سیرۃ النبی ﷺ پر خطبات کا سلسلہ
شروع کیا ہے۔

اس سلسلہ کا آغاز ۱۴۲۰ھ (۱۹۹۹ء) میں ہوا تھا ، ۳/ ۱۱ تا ۱۱ جولائی ۱۹۹۹ء بالجسارت عالم
دین ، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے معتمد تعلیم مولانا عبد اللہ عباس صاحب ندوی کے سات
خطبات ہوئے ، یہ خطبات ”پیغمبر اخلاق و انسانیت“ کے نام سے کتاب کی صورت میں شائع ہو
چکے ہیں۔ دوسرے سال ۱۴۲۱ھ (۲۱/ ۱۲ تا ۲۸/ ۱۲) خطبات سیرت
کے لئے مولانا محمد رضوان القاسمی کی طرف سے راقم الحروف کو دعوت دی گئی۔

مرکزی عنوان تھا ”نبی رحمت کا پیام رحمت“ عنوان بر محل ، وقت اور حالات کے
تقاضوں کے عین مطابق تھا ، کیوں کہ اس وقت نہ صرف ہمارے ملک میں بلکہ پوری دنیا میں
شور برپا ہے کہ مسلمان دہشت گرد ہیں ، انتہا پسند ہیں ، بنیاد پرست ہیں۔ ”اسلامی دہشت
گردی“ کے نام سے تمام ذرائع ابلاغ جھنڈا بلند کئے ہوئے ہیں ، چیخ چلا کر ، پورے زور و قوت
سے دنیا کو باور کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ دنیا میں بد امنی ، دہشت گردی ، قتل و غارت

گری کے ذمہ دار مسلمان ہیں، اسلام ہے۔

انقلاب افغانستان کے بعد سے نہ صرف یورپ بلکہ پوری غیر مسلم دنیا سہمی ہوئی ہے کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا کہیں مہِ کامل نہ بن جائے۔ جس اسلام کو دنیا بلکہ بہت سے مسلمان بھی پس پشت ڈال چکے تھے اور اس کو ایک ”مکمل دین“ کے بجائے بس ایک ”مذہب“ اور فرد کا پرائیویٹ معاملہ بنا کر رکھ دیا گیا تھا، کہیں اس کی برکتوں، اس کے عدل و انصاف، اس کی حرکت و نفوذ کی قوت سے دنیا باخبر نہ ہو جائے۔ وہ نظریاتی خلا جو اس وقت پیدا ہو چکا ہے اس کو پر کرنے کے لئے کہیں دنیا کی نگاہیں، اس نظامِ رحمت کی طرف نہ اٹھنے لگیں، اور وہ روحانی پیاس جس کو اس وقت ترقی یافتہ دنیا محسوس کر رہی ہے اس کو بجھانے کے لئے کہیں اس چشمہ آبِ حیات کی طرف نہ لپکنے لگیں۔

انسانی حریت اور فکر و نظر کی آزادی کے یہ نام نہاد علم بردار اس کے لئے تیار نہیں ہیں کہ لوگ پروردگار کی اس زمین پر اس کے عطا کردہ علاقوں میں اپنے رب کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

لیکن یہ سحر ٹوٹ رہا ہے اور یہ طلسم ختم ہو کر رہے گا۔ سچائی کو زیادہ دن، جھوٹ اور فریب کے پردوں میں چھپایا نہیں جاسکتا۔ تاروں کی یہ مدھم بھی صبحِ روشن کے طلوع کا پیغام ہے۔ مولانا محمد رضوان القاسمی صاحب نے اس عنوان (نبی رحمت کا پیغامِ رحمت) کا انتخاب کر کے ثابت کر دیا ہے کہ حالات سے نبرد آزما ہونے کے لئے نبوی طریقہ کار ہی اصل ہے، آگ کو بجھانے کے لئے پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ رحمت دور کرنے کے لئے رحمت کی ضرورت ہے، اور حقیقی رحمت نبی رحمت ﷺ کے پیام میں پوشیدہ ہے۔

اس مرکزی عنوان کے تحت پانچ خطبات تحریری اور تقریری صورت میں پیش کرنے تھے۔ اندازہ یہ لگایا گیا کہ ہر روز تقریباً نصف گھنٹہ تحریری صورت میں اور باقی وقت تقریری صورت میں رکھا جائے۔

کچھ ترمیم اور اضافہ کے ساتھ یہ خطبات آپ کے سامنے ہیں۔

زیرِ نظر خطبات میں علمی و تحقیقی رنگ سے زیادہ ”دعوتی رنگ“ آپ کو زیادہ نمایاں نظر

آئے گا۔ اور شاید بین السطور میں اس جذبہ دروں کی آغچ آپ محسوس کر سکیں جو ان کو لکھتے وقت دل و دماغ میں ایک بجلی کی طرح تڑپتی رہی اور آنسوؤں کی صورت میں چشم نم کو با وضو کرتی رہی، بس یہی ایک سرمایہ اس بے مایہ کے پاس ہے جس کو لیکر وہ رب العالمین کے حضور میں اور رحمۃ للعالمین کی بارگاہ میں حاضر ہونا چاہتا ہے۔

راقم الحروف کو اس کا شدید احساس رہا کہ جن لوگوں کے سامنے لکھا ہوا اسنانا اور زبانی بولنا ہے وہ صاحب گوش ہی نہیں صاحب ہوش بھی ہیں۔ مگر حوصلہ یہ رہا کہ کوئی بات مجھے اپنی کہنی ہے۔ کہنی تو ان ہی کی ہے ”زبان میری ہے بات ان کی“ اور ان کی بات سے زیادہ با وزن بات کس کی ہو سکتی ہے؟

ناسپاسی ہوگی اگر میں مولانا محمد رضوان الملقاسمی صاحب، ان کے لائق فرزندوں اور دارالعلوم سبیل السلام کے محترم اساتذہ، کارکنوں اور طلبہ کا، حیدر آباد کے بزرگوں، بھائیوں اور بہنوں کا، دل و زبان سے شکریہ ادا نہ کروں جنہوں نے اپنی قدر دانی اور محبت و تعلق سے ثابت کر دیا کہ حیدر آباد بہر حال حیدر آباد ہے، اس خطہ میں وہ قدریں آج بھی زندہ ہیں جن کو انسانیت کی آبرو کہا جاتا ہے۔

و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین

مصنف: امین مہل جانا

(فضیل الرحمن ہلال عثمانی)

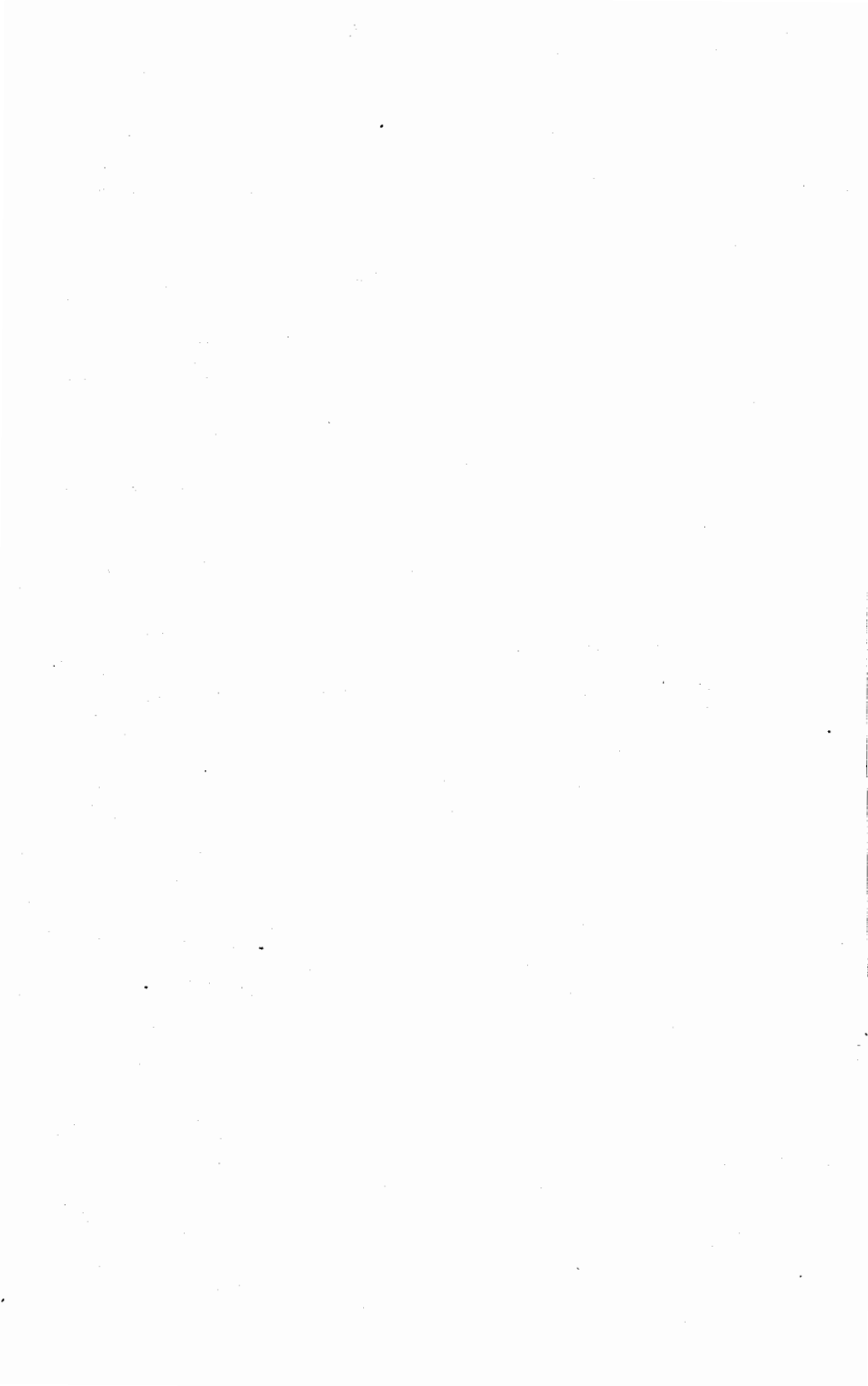
○ دارالسلام اسلامی مرکز

_____ مالیر کوٹلہ (پنجاب)

۳۰ ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ

۲۲ جولائی ۱۹۰۴ء - یکشنبہ





تمهید

تین بنیادی باتیں

”یہ بھی جہاد ہے اور بہت بڑا جہاد ہے کہ ان اندھیروں میں جب کہ اہل حق پر دہشت گردی، بنیاد پرستی اور دوسرے بجا الزامات لگا کر سچائی کا راستہ روکنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اہل ایمان اس طرح کے تمام الزامات کو نظر انداز کرتے ہوئے سچائی کا یہ پیغام اور رحمت کا یہ اعلان دنیا کے گوشے گوشے میں پہونچا دیں کہ اے انسانو! تمہاری نجات اس میں ہے کہ تم اس نظام کو اپنالو جو انسانوں کو انسانوں کا خدا بننے سے روکتا ہے۔ جو طاقت ور کو کمزور کی نگہبانی اور حفاظت سکھاتا ہے۔ جو تمام انسانوں میں مساوات اور برابری پیدا کرتا ہے۔

دنیا نے انسانیت کو آج اس پیام رحمت کی ضرورت سب سے زیادہ ہے اس لئے کہ دنیا آج اپنی مادی ترقیات کے باوجود تباہی کے دہانے پر کھڑی ہوئی ہے۔ اگر رحمت کا یہ پیغام اس تک نہ پہونچا تو شاید وہ تباہی سے نہ خود بخسک سکے گی اور نہ بچا سکے گی۔ اور اس کی ذمہ داری سے غلامانِ محمد (ﷺ) بھی بری الذمہ نہیں ہو سکیں گے۔ اگر انہوں نے اس پیام رحمت کو ہر جگہ پہونچانے کے لئے اپنی توانیوں کو غلو ص نیت کے ساتھ صرف نہ کیا۔“



اس زمین پر انسان کا پہلا قدم پڑا تو وہ اندھیرے میں ٹھو کریں کھانے کے لئے اور اپنا راستہ خود تلاش کرنے کے لئے نہیں تھا بلکہ اس کا پہلا قدم علم کی مکمل روشنی میں تھا..... اور اس کا اس زمین پر آنا ایک پورے منصوبے کے ساتھ تھا..... اگر ہم انسانی تاریخ کے آغاز کی بات کریں اور یہ جاننا چاہیں کہ انسان کی تخلیق، اس کی پیدائش کس منصوبے کے لئے ہوئی؟ اس کو پیدا کرنے والی، عدم سے وجود میں لانے والی ہستی کون ہے؟ کیسی ہے؟ اور یہ سب اس نے کیوں کیا ہے؟ یہ تمام سوالات اپنی جگہ نہایت اہمیت کے حامل ہیں، اور ضرورت ہے کہ ان کے جوابات دیئے جائیں۔ اس پہلو کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم اپنی بات کا آغاز رب کائنات سے کرتے ہیں، اس کے بعد رسالت اور تکمیل رسالت سے متعلق باتیں آئیں گی۔

یہ عظیم کائنات جس کی حدود اور وسعتوں کا اندازہ لگانا ابھی تک انسان کے بس سے باہر نظر آتا ہے۔ اس کائنات کا بنانے والا، تخلیق کرنے والا، پھر پورے منصوبے کے ساتھ اس کو چلانے والا کتنا عظیم ہے۔ اس بڑی کائنات کے مقابلہ میں اگرچہ انسان کی حیثیت پہاڑ کے مقابلہ میں ایک ذرہ کی طرح نظر آتی ہے مگر اس کی خصوصیات پر غور کریں تو لگتا ہے کہ یہ ذرہ بے مقدار جیسے اس عظیم کائنات کا مرکزی نکتہ ہے..... کہنے کو یہ ایک جوہر کی طرح مختصر نظر آتا ہے مگر غور کی نظر سے پتہ چلتا ہے کہ خود بھی یہ ایک کائنات ہی ہو، اور اس عظیم کائنات کی وجہ تخلیق بھی۔

کسی بھی انداز میں کہا جائے مگر انسان کا اپنے خالق کے بارے میں یہ بحث کرنا کہ وہ ہے یا نہیں ہے، اس پر دلائل کی تلاش کرنا ایسا ہی ہے جیسے آدمی خود اپنے بارے میں شک کا اظہار کرے کہ میں ہوں یا نہیں ہوں،

اگر ایک انسان کو یہ یقین ہے کہ وہ ہے، اس کا وجود ہے، وہ سوچتا ہے، سمجھتا ہے، ایک

زندہ وجود کی تمام علامتیں اس میں موجود ہیں، تو یہ کہنا ایک حماقت ہی کہلائے گی کہ وہ خود بخود بغیر کسی پیدا کرنے والے کے پیدا ہو گیا ہے، بغیر کسی بنانے والے کے بن گیا ہے..... انسان کا وجدان، اس کا قلب و دماغ، اس کا شعور و فہم اپنے خالق کے وجود کا خود شاہد ہے..... پھر انسان کے وجود کے ساتھ جو لطافتیں اور حکمتیں جڑی ہوئی نظر آتی ہیں، انسان کے احساسات اور جذبات، اس کا علم، اس کی قدرت، اس کا ارادہ، قدم قدم پر اس کے وجود کی معنویت اور گہرائی کو نمایاں کرتا ہے۔ یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کا خالق کوئی معمولی ہستی نہیں ہے، بلکہ وہ اعلیٰ درجہ کا حکیم و دانا اور لطیف و خبیر ہے۔

اس لئے اسلام نے خدا کے وجود کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی صفات، اس کی قدرت، اس کی عظمت، اس کا علم اور اس کی حکمت جو اس کائنات کے ذرہ ذرہ سے پھوٹی پڑتی ہے اس کو سامنے رکھ کر اس کی وحدت اور اس کی یکتائیت کو تسلیم کیا ہے یعنی اس کا وجود صرف وجود ہی نہیں ہے بلکہ تمام کمالات کا سرچشمہ اور مخزن ہے۔ اس کائنات میں نظر آنے والا ہر کمال اس کے کمال کا پر تو اور ہر حسن اس کے حسن کا جلوہ ہے..... انسان اس رب عظیم کی تخلیق کا شاہکار ہے۔

من عرف نفسه فقد عرف ربه جس نے اپنے کو پہچان لیا اس نے اپنے رب
(المقاصد الحسنۃ حدیث نمبر ۱۱۴۹، بحوالہ کو پہچان لیا
کشف الخفاء ۲/ ۲۶۲)

یہ بات دراصل اس حقیقت کا اظہار ہے کہ انسان کا اپنے آپ کو پہچان لینا..... اپنے رب کو پہچاننے کے لئے پہلا مرحلہ ہے.....

علم کا یہ خاص انداز جو صرف انسان میں پایا جاتا ہے کہ اس کے اندر وہ قوت و ذکاوت ہے یعنی معلوم سے نامعلوم کو حاصل کرنے کی صلاحیت موجود ہے جو کہ اس کو تمام مخلوقات سے ممتاز اور نمایاں کرتی ہے۔ علم کی یہ خاص صلاحیت اس پوری کائنات میں کسی اور مخلوق میں نہیں پائی جاتی..... یہاں تک کہ فرشتے جو اللہ کی ایک نورانی مخلوق ہیں اور ان میں نیکی اور اطاعت کے سوا کوئی اور رجحان ہی نہیں ہے وہ بھی علم کے اس زیور سے آراستہ نہیں ہیں جو انسان کی عقل و فہم کی زینت ہے۔

قرآن مجید میں فرشتوں اور پروردگار کے درمیان جو گفتگو نقل کی گئی ہے، اور پھر انسان کے مقام کو بتانے کے لئے اس کی خلافت کا اعلان کیا گیا ہے وہ صرف ایک تاریخ ہی نہیں ہے، بلکہ انسان کی اس خاص صفت اور مقام کا اظہار ہے جس کے لئے انسان کو اس زمین پر خاص حکمت اور مصلحت سے بھیجا گیا ہے۔

آئیے اس واقعہ پر جس کو قرآن نے اپنے خاص اسلوب میں بیان کیا ہے ایک نظر ڈالتے چلیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کرہ ارض پر جو اس وقت انسان کا مسکن ہے انسان سے پہلے ایک مخلوق آباد تھی اس کا کچھ حصہ آج بھی اس زمین پر رہتا ہے..... اللہ کی وہ مخلوق ”جن“ کے نام سے موسوم ہے..... قرآن مجید میں ہے

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ہم نے جنوں اور انسانوں کو اپنی عبادت ہی
(الذاریات: ۵۶) کے لئے پیدا کیا ہے

معلوم ہوا کہ جنات کی پیدائش بھی اور ان کو زمین پر بسانا بھی بے مقصد نہیں تھا، بلکہ پروردگار نے ان کو بھی اپنی بندگی کے لئے پیدا کیا تھا اور یقیناً ان کے بہت سے افراد عبادت گزار ہوں گے، جیسا کہ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات میں بھی دو طرح کے جن ہیں، نیک بھی اور بد بھی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جنات فرشتوں کی طرح بالکل بے اختیار نہیں تھے، بلکہ ان کو بھی ماننے اور نہ ماننے کی آزادی تھی۔ اس لئے کچھ ماننے والے ہوئے اور کچھ نہ ماننے والے ہوئے۔ اس قوم جنات کا ایک فرد ابلیس نام کا بھی تھا جس کا اصل نام عزریل تھا، اور وہ اب شیطان کے لقب سے پکارا جاتا ہے..... معلوم ہوتا ہے کہ عزریل خاصا عبادت گزار فرشتوں میں مقبول اور مقرب بارگاہ الہی تھا..... وقت گذرا..... جنات میں شر و فساد بڑھتا گیا اور جب یہ حد سے گذر گیا، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ ان کو قتل کرو، تاکہ زمین سے شر و فساد کا خاتمہ ہو سکے..... بڑی مقدار میں جنات قتل ہو گئے..... کچھ پہاڑوں اور جنگلوں میں چھپ گئے..... ان کی نسل اگرچہ باقی رہی لیکن ایک طرح سے زمین کو ان سے خالی کر لیا گیا..... یہ خالی کرنا دراصل اس منصوبے کا آغاز تھا کہ ابھی زمین پر کسی اور کو کسی وجہ سے آباد کرنا ہے..... چنانچہ بارگاہ الہی سے اعلان ہوا کہ :

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَہٗ کہ ہم عنقریب زمین پر ایک نائب اور خلیفہ (البقرہ: ۳۰) قائم کرنا چاہتے ہیں۔

یہ اعلان ہونا تھا کہ پچھلے مچ گئی..... فرشتے دم بخود اور حیران تھے کہ ایسا کیسے ہو گا؟ تو ادھر ابلیس کے دل میں سوئی ہوئی ایک تمنا آہستہ آہستہ جاگ رہی تھی کہ شاید میری عبادت گزاری آج کام آئے گی اور زمین کی خلافت کا تاج میرے سر پر جگمگائے گا..... اس آرزو نے اس کو بے چین کر دیا..... ٹوہ میں لگا رہا کہ دیکھو پردہ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ اسی دوران میں اس نے دیکھا کہ مٹی کے کھٹکتے ہوئے گارے سے ایک پتلا تیار کیا جا رہا ہے..... وہ چونکا کہ یہ نئی بات کیا ہے..... پتلا تیار ہو چکا تھا..... جائزہ لینے کے لئے ابلیس پتلے کے اندر گھسا..... دیکھا کہ اندر خول ہے اور خول کے سوا کچھ نہیں ہے..... اللہ تعالیٰ کے منصوبے کا دوسرا حصہ یہ تھا کہ آدم علیہ السلام جس کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ”خَلَقْتُ بَیْدًی“ (ص: ۷۵۔ میں نے اس کو اپنے ہاتھوں سے بنایا) گویا ہاتھوں سے بنا کر کہنے سے اس کے شرف کا اظہار ہے اور اس خصوصیت کو بتاتا ہے کہ ہمارے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیز ہے..... منصوبے کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ ”نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ“ (الحجر: ۲۹۔ میں نے اس میں اپنی روح پھونکی، جان ڈالی) جیتا جاگتا ایک وجود عدم سے ظہور میں آیا..... ادھر فرشتوں نے اپنی حیرانی کا اظہار اس انداز میں کیا کہ کیا آپ اس کو اپنا نائب بنائیں گے اس کو عمل کی آزادی، ارادہ اور اختیار دیں گے، ”مَنْ يُفْسِدْ فِيْهَا وَ يَسْفِكِ الدِّمَآءَ“ (البقرہ: ۳۰۔ جو زمین میں خلیفہ بن کر، آزادی پا کر فساد برپا کرے گا، خونریزی کرے گا) جس طرح اس سے پہلے جنات کے معاملے میں ہو چکا ہے۔ اس سوال کا پہلا جواب بارگاہ الہی سے شان جلالی کے ساتھ یہ تھا کہ ”اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ“ (البقرہ: ۳۰۔ ہم جانتے ہیں تمہیں ان باتوں کا پتہ نہیں ہے) منصوبہ کا دوسرا حصہ یہ تھا کہ ”وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا“ (البقرہ: ۳۱۔ کہ آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھائے)۔ یعنی پروردگار نے خود ان کو تعلیم دی، زیور علم سے آراستہ کیا، قوت و دلاکت دی، فہم و شعور دیا اور ہر طرح کے ہتھیاروں سے پوری طرح لیس کرنے کے بعد اب فرشتوں کے سامنے پیش کیا۔

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ
فرشتوں سے کہا گیا کہ اگر تم سچے ہو تو فلاں
فلاں چیزوں کے نام بتاؤ۔

(البقرہ : ۳۱)

فرشتوں کا علم محدود تھا، ان کا علم اپنے دائرہ کار کے مطابق تھا۔ اسباب کے درجے میں وہ اس کائنات کے رب کی طرف سے مقرر کئے گئے کارکن تھے، ان کو اتنا ہی علم دیا گیا تھا جو ان کے کام کے متعلق تھا..... اور ان کا کام یہ تھا کہ وہ اپنے رب کے احکام کی تعمیل کریں..... نافرمانی کی صلاحیت ان میں رکھی ہی نہیں گئی۔ کیوں کہ نہ اس کی ضرورت تھی اور نہ مصلحت، فرشتوں کو رائے کی آزادی اور اختیار بھی نہیں تھا، البتہ جنات کو انسانوں کی طرح محدود اختیار دیا گیا، مگر ان میں علم کی وہ صلاحیتیں اور خصوصیات نہیں ہیں جو انسانوں میں ہیں۔ اسی لئے ابلیس کا دعویٰ خلافت بے معنی سمجھا گیا، اور اس کا آدم علیہ السلام کو خلیفہ ماننے سے انکار کرنا حکم الہی کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا مانا گیا، اور اس کو مردود بارگاہ الہی قرار دیا گیا..... فرشتوں نے عاجزی کے ساتھ اعتراف کر لیا.....

سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا
پروردگار آپ ہر عیب سے پاک ہر تعریف کے مستحق ہیں۔ ہمارا علم تو بس اتنا ہی ہے جتنا
(البقرہ : ۳۲)

آپ نے عطا فرمادیا۔

فرشتوں نے اور دوسری مخلوقات نے خلافتِ آدم علیہ السلام کو بہ دل و جان تسلیم کیا، سر جھکا دیا، ”إِلَّا إِبْلِيسَ“ مگر ابلیس جو منکر ہوا اور ”وَسَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ“ (البقرہ : ۳۳) انکار کرنے والوں اور ناشکروں میں شامل ہو گیا)

چلتے چلتے ابلیس نے دو باتیں پروردگار سے اپنے لئے مانگ لیں..... ایک حیاتِ تاقیامت، دوسرے بھٹکانے اور گمراہ کرنے کی آزادی..... خاص مصلحت کے تحت یہ دونوں مطالبے منظور کر لئے گئے۔ منصوبے کا دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ زمین پر بھیجنے سے پہلے جو آدم علیہ السلام کا دار الخلافہ تھا ان کو جنت میں رکھا گیا..... آدم علیہ السلام جنت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے مگر فطرت کے مطابق انہوں نے تنہائی کا شکوہ کیا اور ایک ساتھی کی مانگ کی.....

حضرت آدم علیہ السلام کی درخواست منظور کی گئی..... ”وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا“ (النساء: ۱) اور انہی جیسا ان کا جوڑا عورت کی شکل میں حضرت حوا کو پیدا کیا گیا۔ اب یہ پہلا انسانی جوڑا پروردگار کی جنت میں وقت گزار رہا تھا۔ یہیں سے ان دونوں کی آزمائش کا پہلا مرحلہ شروع ہو گیا..... حکم ہوا کہ جنت میں تم جہاں چاہو جاؤ، کھاؤ پیو..... ”وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا“ مگر خیال رہے کہ ”وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ“ (دیکھو یہ جو خاص درخت ہے جنت میں بس اس کے پاس مت جانا۔ قریب جاؤ گے تو ڈر ہے کہ اس کے پھل بھی کھاؤ گے، اور یہ ممانعت جو ہماری طرف سے ہے اس کے خلاف کرو گے تو تمہارا شمار ظالموں میں ہو گا ”فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ“ (البقرہ: ۳۵)

ادھر یہ ممانعت، ادھر شیطانی منصوبے کا آغاز ہوتا ہے..... ”فَازَلَهُمَا الشَّيْطَانُ“ آدم و حوا علیہما السلام دونوں کو پھسلایا، سبز باغ دکھائے، وقتی فائدے دکھا کر جھایا۔ آدم و حوا علیہما السلام بہکاوے میں آ گئے۔ اس شجر ممنوعہ کا پھل کھالیا۔ فوراً ہی نتیجہ سامنے آیا کہ ”بَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا“ (الاعراف: ۲۲) دونوں ایک دوسرے کے سامنے بے لباس تھے درخت کے پتوں سے شرم گاہوں کو ڈھانپنے کی کوشش کر رہے تھے۔ واقعہ کے اس پہلو کو گرفت میں رکھتے ہوئے غور کیجئے کہ..... انسان کے اخلاق اور اس کے کردار کی تباہی کے لئے شیطان کا پہلا حملہ اس کے لباس پر ہوتا ہے، آج جو یہ عریانی، بے حیائی اور بے شرمی کی لہر چل رہی ہے..... تہذیب کے نام پر یہ بد تہذیبی کے مظاہرے ہو رہے ہیں یہ انسانیت کی تباہی کا شیطانی منصوبہ ہے۔

جنت میں اس امتحان کا فضا ظاہر ہے یہ تھا کہ آدم علیہ السلام کو اپنی خویوں کے ساتھ ساتھ اپنی فطری کمزوریوں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو جائے، اور جب وہ کافر خلافت انجام دینے کے لئے اپنے دار الخلافہ میں جائیں تو انہیں خوب اندازہ ہو کہ ان میں کمزور پہلو کون سا ہے اور اس سے بچاؤ کا طریقہ کیا ہے۔

حکم عدولی تو کر بیٹھے، مگر انسانی فطرت کا یہ پہلو کتنا قابل قدر ہے کہ فوراً ہی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا..... نادام اور شر مندہ ہوئے..... ندامت کا یہ عالم تھا کہ الفاظ ڈھونڈتے تھے

تو توبہ کے لئے الفاظ نہیں ملتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو توبہ کے لئے الفاظ بتائے کہ ہم سے یوں مانگو

رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرَحُّمًا لَّنْكَوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ
 پروردگار ہم نے اپنے اوپر بڑا ظلم کیا اگر آپ نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم (الاعراف: ۲۳) بڑے خسارے میں رہیں گے۔

اللہ کی رحمتوں کی وسعت دیکھئے کہ توبہ کے الفاظ بھی سکھائے اور توبہ قبول بھی فرمائی اعلان ہوا کہ تمہیں معاف کر دیا گیا تم اس جرم سے بری قرار دے گئے۔ اب اس کے لئے کسی کفارہ کی ضرورت نہیں ہے کہ تمہارے گناہ کی پاداش میں کسی ”پیارے“ کو سولی پر لٹکنا پڑے توبہ قبول کر لی گئی مگر اب تمہیں اپنے دار الخلافہ زمین پر جانا ہے اور وہاں کچھ عرصہ رہنا ہے زندگی کے سارے سامان تمہیں وہاں موجود ملیں گے اور پھر لوٹ کر ہمارے پاس آنا ہے یہ جنت گمشدہ تمہاری منتظر رہے گی.....

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ
 تمہارے لئے زمین پر ٹھکانا ہے اور زندگی کا سامان ہے ایک مقررہ مدت تک۔ (البقرہ: ۳۶)

اب اس واقعہ کو بھی ذہن میں تازہ کر لیجئے جو قرآن مجید میں ”عہد اُکنت“ کے نام سے ذکر کیا گیا ہے اور احادیث میں اس کی قدرے تفصیل بھی ہے:

قرآن مجید میں اس واقعہ کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے..... ارشاد ہے:

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ (م) بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ شَهِدْنَا أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَمَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا غَافِلِينَ أَوْ تَقُولُوا إِنَّمَا أَشْرَكَ آبَاؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِنْ بَعْدِهِمْ أَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُونَ

(اور اس واقعہ کو ذکر کیجئے) آپ کے پروردگار نے نکالا اولاد آدم کی پشت سے ان کی نسل کو پیدا کیا اور خود انہی کو ان کی جانوں پر گواہ کیا (اور کہا) کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ بولے ضرور ہیں، ہم کو اسی دیتے ہیں (یہ اس لئے ہوا) کہ کہیں تم قیامت کے دن یہ نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے مایوں کہنے لگو کہ شرک تو ہمارے باپ دلا

(الاعراف : ۱۷۲، ۱۷۳)

پہلے ہی سے کرتے آئے اور ہم تو ان کے بعد ان کی
نسل میں ہوئے تو کیا تو ہلاک کر دے گا ہمیں
(اصلی) اہل باطل کے کر توت کی بنا پر۔

اس آیت پر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی تحریر بھی قابل مطالعہ ہے اور اس سے اس واقعہ کی پوری تصویر اپنی نوک پلک کے ساتھ واضح ہو جاتی ہے۔ تحریر فرماتے ہیں کہ.....
”یثاق خاص کے بعد یہاں سے ”یثاق عام“ کا ذکر کرتے ہیں۔ تمام عقائد حقہ اور ادیان ساویہ کا بنیادی پتھر یہ ہے کہ انسان خدا کی ہستی اور ربوبیت عامہ پر اعتقاد رکھے۔ مذہب کی ساری عمارت اسی سنگ بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے۔ جب تک یہ اعتقاد نہ ہو، مذہبی میدان میں عقل و فکر کی رہنمائی اور انبیاء و مرسلین کی ہدایات کچھ نفع نہیں پہنچا سکتیں۔ اگر پورے غور و تامل کے ساتھ دیکھا جائے تو آسمانی مذہب کے تمام اصول و فروع بالآخر خدا کی ”ربوبیت عامہ“ کے اسی عقیدہ پر منتہی ہوتے، بلکہ اسی کی تہہ میں لپٹے ہوئے ہیں۔ عقل سلیم اور وحی والہام اسی اجمال کی شرح کرتے ہیں۔ پس ضروری تھا کہ یہ تخم ہدایت جسے کل آسمانی تعلیمات کا مبداء و منتهی اور تمام ہدایات ربانیہ کا ”وجود مجمل“ کہنا چاہئے عام فیاضی کے ساتھ نوع انسانی کے تمام افراد میں بکھیر دیا جائے تاکہ ہر آدمی عقل و فہم اور وحی والہام کی آبیاری سے اس تخم کو شجر ایمان و توحید کے درجہ تک پہنچا سکے۔ اگر قدرت کی طرف سے قلوب بنی آدم میں ابتداء یہ تخم ریزی نہ ہوتی اور اس اساسی وجوہی عقدہ کا حل ناخن عقل و فکر کے سپرد کر دیا جاتا تو مسئلہ بن کر رہ جاتا جس پر سب تو کیا اکثر آدمی بھی متفق نہ ہو سکتے۔ جیسا کہ تجربہ بتلاتا ہے کہ فکر و استدلال کی ہنگامہ آرائیاں اکثر اتفاق سے زیادہ اختلاف آراء پر منتج ہوتی ہیں۔ اس لئے قدرت نے جہاں غور و فکر کی قوت اور نور وحی والہام کے قبول کرنے کی استعداد دینی آدم میں ودیعت فرمائی، وہیں اس اساسی عقیدہ کی تعلیم سے ان کو فطرۃً بکھیر دیا، جس کے اجمال میں کل آسمانی ہدایت کی تفصیل تھی۔ اور جس کے بدون مذہب کی عمارت کا کوئی ستون کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ اسی ازلی اور خدائی تعلیم کا اثر ہے کہ آدم علیہ السلام

کی اولاد ہر قرن اور ہر گوشہ میں حق تعالیٰ کی ربوبیت عامہ کے عقیدہ پر کسی نہ کسی حد تک متفق رہی ہے، اور جن محدود افراد نے کسی عقلی و روحی بیماری کی وجہ سے اس عام فطری احساس کے خلاف آواز بلند کی ہے، وہ انجام کار دنیا کے سامنے بلکہ خود اپنی نظر میں بھی اسی طرح جھوٹے ثابت ہوئے جیسے ایک بخار وغیرہ کا مریض لذیذ خوشگوار غذاؤں کو تلخ اور بد مزہ بتلانے میں جھوٹا ثابت ہوتا ہے۔ بہر حال ابتدائے آفرینش سے آج تک ہر درجہ اور طبقہ کے انسانوں کا خدا کی ربوبیت کبریٰ پر عام اتفاق و اجماع اس کی زبردست دلیل ہے کہ یہ عقیدہ عقول و افکار کی داود و ہش سے پہلے ہی فاطر حقیقی کی طرف سے اولاد آدم علیہ السلام کو بلا واسطہ تلقین فرمادیا گیا، ورنہ فکر و استدلال کے راستہ سے ایسا اتفاق پیدا ہو جانا تقریباً ناممکن تھا۔ قرآن کریم کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ اس نے آیت حاضرہ سے عقیدہ کی اس فطری یکسانیت کے اصلی راز پر روشنی ڈالی، بلاشبہ ہم کو یاد نہیں کہ اس بنیادی عقیدہ کی تعلیم کب اور کہاں اور کس ماحول میں دی گئی، تاہم جس طرح ایک لیکچرار اور انشاء پرداز کو یقین ہے کہ ضرور اس کو ابتدائے عمر میں کسی نے الفاظ بولنے سکھائے جس سے ترقی کر کے آج اس رتبہ کو پہنچا، گو پہلا لفظ سکھانے والا اور سکھانے کا وقت، مکان اور دیگر خصوصیات مقامی بلکہ نفس سکھانا بھی یاد نہیں۔ تاہم اس کے موجودہ آثار سے یقین ہے کہ ایسا واقع ضرور ہوا ہے۔ اسی طرح بنی نوع انسان کا علی اختلاف الاقوام والابیال ”عقیدہ ربوبیت الہی“ پر متفق ہونا اس کی کھلی شہادت ہے کہ یہ چیز بدء فطرت میں کسی معلم کے ذریعہ سے ان تک پہنچی ہے۔ باقی تعلیمی خصوصیات و احوال کا محفوظ نہ رہ سکتا اس کی تسلیم میں خلل انداز نہیں ہو سکتا۔ اسی ازلی و فطری تعلیم نے جس کا نمایاں اثر آج تک انسانی سرشت میں موجود چلا آتا ہے۔ ہر انسان کو خدا کی حجت کے سامنے ملزم کر دیا ہے جو شخص اپنے الحاد و شرک کو حق بجانب قرار دینے کے لئے غفلت، بے خبری یا آباؤ اجداد کی کورانہ تقلید کا عذر کرتا ہے اس کے مقابلہ پر خدا کی یہی حجت قاطعہ جس میں اصل فطرت انسانی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے بطور فیصلہ کن جواب کے پیش کی جاسکتی ہے۔ حضرت

شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی اولاد اور ان سے ان کی اولاد نکالی سب سے اقرار کر دیا اپنی خدائی کا۔ پھر پشت میں داخل کیا۔ اس سے مدعا یہ ہے کہ خدا کے رب مطلق ماننے میں ہر کوئی آپ کفایت کرتا ہے۔ باپ کی تقلید نہ چاہئے اگر باپ شرک کرے بیٹے کو چاہئے ایمان لاوے۔ اگر کسی کو شبہ ہو کہ وہ عہد تو یاد نہیں رہا پھر کیا حاصل؟ تو یوں سمجھ کہ اس کا نشان ہر کسی کے دل میں ہے اور ہر زبان پر مشہور ہو رہا ہے کہ سب کا خالق اللہ ہے، سارا جہان قائل ہے اور جو کوئی منکر ہے یا شرک کرتا ہے سو اپنی عقل ناقص کے دخل سے پھر آپ ہی جھوٹا ہوتا ہے“

(حاشیہ ترجمہ شیخ الہند آیت مذکورہ)

اس واقعہ اور اس کی تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا نقش انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ ”فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا“ (الروم: ۳۰)۔ اللہ کی بنائی ہوئی وہ فطرت جس پر انسانوں کو بنایا گیا ہے) اور پھر اس ارشاد نبوی ﷺ کو بھی سامنے رکھ لیجئے جس میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ ہر آنے والا بچہ اپنی صحیح فطرت یعنی اللہ کی فرماں برداری اور اس کی ربوبیت کا اقرار لے کر آتا ہے۔ فرمایا:۔

ما من مولود الا يولد على الفطرة
 فابواه يهودانه وينصرانه ويمجسانه.
 (عن امی ہریرۃ مسلم ۳۲۶ / ۲) دیتے ہیں۔

اسلام نے رب کے اقرار کے اس فطری تقاضے کی نوک پلک کو اچھی طرح سنوار دیا ہے اور توحید کا ایک جامع اور مکمل بے غبار تصور دیا ہے..... اسلام میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ہر طرح سے مکمل ہے.....
 یعنی.....

○ اس کی ذات میں کوئی حصہ دار نہیں وہ اپنی ذات اور وجود کے اعتبار سے اکیلا ہے اس

پوری کائنات میں کوئی اور ”الہ“ نہیں ہے جو اس کی طرح ہو اور اس کی ذات میں شریک ہو۔ اس کو اصطلاحی الفاظ میں ”توحید فی الذات“ کہتے ہیں، اور اسی کو قرآن مجید کے سورہ اخلاص میں فرمایا ”قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ“ (کہو کہ اللہ ایک ہے) یعنی اس کی ذات ایک ہے..... اس کائنات کے دو یا زیادہ خدا نہیں ہیں۔

• جس طرح وہ اپنی ذات میں یکتا ہے اسی طرح وہ اپنی صفات میں بھی یکتا ہے..... اس کی صفتوں میں کوئی دوسرا شریک و سہیم نہیں ہے..... اللہ تعالیٰ کی صفات عالیہ میں تین صفتیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں.....

وہ قیوم ہے..... یعنی بغیر کسی سہارے کے خود قائم ہے اور دوسروں کو قائم رکھتا ہے۔ وہ ”حَی“ یعنی زندہ ہے..... اس کی حیات بغیر کسی کے سہارے خود قائم ہے اور وہ دوسروں کو زندگی دینے والا ہے۔

تیسرے یہ کہ وہ مُمِیت ہے..... یعنی حیات کی طرح موت بھی اس کے قبضہ میں ہے جس کو چاہے وہ زندگی دے اور جس کو چاہے موت دے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں نمرود کے سامنے جو آپ کی گفتگو ہوئی اور نمرود نے سوال کیا کہ تمہارا رب کون ہے؟..... اس کے جواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہی فرمایا۔

رَبِّی الَّذِیْ یُحْیِیْ وَیُمِیتُ (البقرہ: ۲۵۸) میرا رب وہ ہے جو زندگی اور موت دیتا ہے اسلام نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ جس طرح انسان کی صفات کو اس کی ذات سے الگ نہیں کیا جاسکتا اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات اس کی ذات کے ساتھ وابستہ ہیں..... ذات سے ہٹ کر صفات کا الگ وجود نہیں ہے کہ ہم کسی کو رزق دینے والا مان لیں اور اس کی پوجا شروع کر دیں..... کسی کو طاقتور مان کر اس کے آگے سر جھکانے لگیں..... کسی کو نافع مان کر اس کو ربوبیت کے مقام پر بٹھادیں۔ جس طرح اللہ کی ذات یکتا ہے اسی طرح اس کی صفات بھی یکتا ہیں اور اس کی ذات کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں..... اس کو اصطلاحی الفاظ میں ”توحید فی الصفات“ کہتے ہیں۔

○ اسی طرح اسلام نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اپنی عظمت اور کبریائی کے لحاظ سے بھی اللہ تعالیٰ یکتا ہیں..... جو عظمت اللہ تعالیٰ کی ہے اس میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں ہے..... اس کا نام ”توحید فی العظمت“ ہے اور اسلام کا معروف کلمہ ”اللہ اکبر“ جو نمازوں اور مختلف موقعوں پر مومنین کی زبانوں سے ادا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی اسی کبریائی اور عظمت کو ظاہر کرتا ہے۔

○ جب اللہ تعالیٰ ہر اعتبار سے یکتا اور بے مثال ہیں تو عبادت کے مستحق بھی وہی ہیں..... لفظ ”الہ“ میں جو لالہ الا اللہ کا ایک جز ہے اللہ کی عبادت اور عظمت سب کو سمیٹ لیا گیا ہے۔ اس کو اصطلاح میں ”توحید فی العبادت“ کہتے ہیں کہ عبادت صرف اللہ ہی کی ہو سکتی ہے اور عبادت کے جتنے مراسم ہیں سجدہ، رکوع، نذر و نیاز وہ سب اللہ ہی کے لئے خاص ہیں۔

○ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی اطاعت میں بھی یکتا ہیں..... یعنی اطاعت صرف اللہ کی کرنی ہے اور جہاں اللہ کی نافرمانی ہوتی ہو وہاں کسی کی بھی اطاعت اور فرماں برداری نہیں ہو سکتی..... فرمایا ”لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ“ (مسند احمد عن علی بن ابی طالب حدیث نمبر ۱۰۹۵ بیت الافکار ریاض۔ یعنی مخلوق میں جو بھی ہیں حکومت ہو، حاکم ہو، والدین ہوں، ان کی اطاعت اور فرماں برداری وہیں تک ہے، جہاں تک اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی نہ ہو۔ اور جہاں ان کا حکم اللہ کے حکم سے ٹکرائے تو اللہ کا حکم مانا جائے گا اور کسی دوسرے کا حکم قابل تسلیم نہ ہو گا..... اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ”هُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَهٌ“ (الزخرف: ۸۴۔ وہی آسمانوں کا بھی خدا ہے اور وہی زمین کا بھی) یعنی جس طرح اس کا حکم آسمانوں پر چلتا ہے اسی طرح اس کے احکام زمین پر بھی نافذ ہونے چاہئیں۔ اور اللہ کے ماننے والوں کا فرض ہے کہ اس کے نظام اطاعت کو قائم کریں اور جہاں قائم نہ ہو وہاں قائم کرنے کی جدوجہد میں لگے رہیں..... اس کا ابتدائی طریقہ دعوت و تبلیغ اور پھر دعوت و تبلیغ کے ذریعے ایسا معاشرہ قائم کرنا ہے کہ اس میں اللہ کے تمام احکام کا نفاذ ہو سکے۔ اللہ کی حکومت قائم کرنا اگرچہ بذات خود مقصود نہیں ہے مگر اس مقصد کو حاصل کرنے کا ایک مؤثر اور قوی ذریعہ ہے کہ جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے احکام

ہم خود اپنے اوپر اور سماج کے اوپر جاری اور نافذ کر سکیں..... یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اسلام کا ایک بہت بڑا حصہ اخلاقیات سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن تنہا اخلاقیات کافی نہیں ہیں بلکہ ترغیب کے ساتھ ترہیب اور رغبت دلانے کے ساتھ زور و قوت کی بھی ضرورت ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کی صفت بشر کے ساتھ نذیر بھی فرمائی ہے۔ اور اہل ایمان کی ذمہ داری امر بالمعروف کے ساتھ نہی عن المنکر بھی ہے جس کے لئے زور و قوت کی ضرورت ہے۔ اور آخری منزل ”وَيَكُونُ الَّذِينَ كُفُّوا لَهُ“ (الانفہال: ۳۹) کہ دین سب کا سب اللہ کے لئے ہو جائے) اس آخری منزل کو پانے کے لئے بھی زور و قوت کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ ظلم کی طاقتوں کو توڑنا تاکہ حق قبول کرنے والوں کے لئے راستہ صاف ہو جائے۔ اس کے لئے بھی زور و طاقت ناگزیر ہے۔ اس لئے ”توحید فی الطاعة“ کا تقاضہ ہے کہ اخلاقی نظام کے ساتھ سیاسی نظام بھی قائم ہو اور اللہ کے احکام کی تعمیل کے لئے فضاہر طرح سازگار ہو۔

○ توحید کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ ہمارے تمام اعمال کا مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہو جائے..... کہ ہم جو کام بھی کریں اپنے رب کو راضی کرنے کے لئے کریں..... ہمارے ہر عمل کا مقصود صرف اور صرف رضائے رب ہو..... یہ ”توحید فی المقصود“ انسان کے اندر حد درجہ اخلاص پیدا کر دیتی ہے اور ہر طرح کے کھوٹ اور ریاکاری سے انسان کی نیت اور ارادے کو پاک و صاف کر دیتی ہے..... اور یہی دراصل تمام اعمال صالحہ کی جان ہے اور آخرت کا اجر و ثواب اسی اخلاص نیت اور حسن ارادہ پر موقوف ہے..... اعمال کی ظاہری صورت جیسی بامعنی بنتی ہے جب ان کے اندر اخلاص نیت کی روح کار فرما ہو..... اسی لئے فرمایا۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى اجْسَادِكُمْ وَلَا إِلَى صُورِكُمْ وَلَكِنَّ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ .
 اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں، صورتوں اور ظاہر کو نہیں دیکھتا بلکہ اس کی نگاہ تمہارے دلوں پر رہتی ہے..... (مسلم شریف ۲ / ۳۱۷ عن ابی ہریرہ)

○ توحید ہی کی ایک اہم قسم ”توحید فی المحبت“ ہے..... یعنی اپنے پروردگار کی ایسی محبت کہ اس کے مقابلے میں کسی دوسری چیز کی محبت کی کوئی اہمیت باقی نہ رہے، بلکہ ہر چیز

کی محبت اللہ کی محبت کی وجہ سے ہو ”الْحُبُّ فِي اللَّهِ وَ الْبُغْضُ فِي اللَّهِ“ (بخاری شریف جلد اول کتاب الایمان) یعنی اگر مخلوق میں کسی سے محبت ہے تو اس لئے کہ وہ اللہ کی محبت کا تقاضا ہے جو اللہ کی نظر میں محبوب ہے وہ ہمیں بھی محبوب ہے اور جو اللہ کی نظر میں مبغوض ہے وہ ہمیں کیسے محبوب ہو سکتا ہے اللہ کی محبت میں ایسا ڈوب جانا کہ اس کا دوست ہمارا دوست ہو جائے اور اس کا دشمن ہمارا دشمن اس کی پسند ہماری پسند بن جائے اور جو اس کو ناپسند ہو وہ ہمارے لئے بھی قابل نفرت ہو۔

رسالت

غرض یہ کہ اسلامی توحید ہر طرح سے مکمل، جامع اور مانع ہے اور توحید کا عقیدہ ہی وہ عقیدہ ہے جو تمام مذاہب سماویہ کی بنیاد ہے مذہب کی بنیاد توحید کی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے یہ بنیاد جتنی مضبوط ہوگی مذہب بھی اتنا ہی مستحکم ہوگا، اگر یہ بنیاد کمزور ہو تو کمزور بنیادوں پر تعمیریں نہیں ہوا کرتیں اس لئے اسلام نے عقیدہ توحید کو ہر طرح سے نکھار کر پیش کیا ہے۔ اس اقرار ربوبیت اور توحید کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ معاملہ صرف انسانوں پر نہیں چھوڑا، بلکہ ان کی فطرت میں بذات خود اس کا بیج بو دیا اب اس بیج کو بار آور کرنے کے لئے اور اس سے درخت نکالنے، اور اس کو سرسبز و شاداب رکھنے کے لئے کن کن چیزوں کی ضرورت ہے، اس کی تفصیلات سے آگاہ کرنے کے لئے اس نے ہر دور میں اپنے نبیوں اور رسولوں کو مبعوث کیا، تاکہ وہ انسانوں کے سامنے اس ربوبیت کی تفصیلات اپنے قول و عمل سے پیش کر سکیں، جس کا ختم ہر انسان کے قلب میں موجود ہے اور جو اس کی فطرت میں گندھا ہوا ہے حقیقت یہ ہے کہ رسالت یعنی اللہ تعالیٰ کا ہر دور میں اپنے نبیوں اور رسولوں کو مقرر کرنا اس کی ربوبیت کا ہی مظاہرہ ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہیں، رحیم اور شفیق ہیں اس لئے اپنی کرم نوازی کی وجہ سے وہ چاہتے ہیں کہ میرے بندے صحیح راستے پر چلیں صحیح طریقے پر زندگی گزاریں میرے انعامات سے نوازے جائیں ان کے مرتبے بلند ہوں دنیا میں بھی کامیاب

رہیں باہر اور ہیں اور آخرت میں بھی سرخ رو ہو کر میرے سامنے آئیں تاکہ میں اپنی عنایتوں کی بارش ان پر برساؤں۔

رسالت کا یہ سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا..... حضرت آدم علیہ السلام علم کی روشنی کے ساتھ دنیا میں تشریف لائے..... اپنی اولاد کو ہدایت کے راستے سے آگاہ کیا..... اور رسالت کا یہ سلسلہ حضرت محمد رسول ﷺ پر نہ صرف یہ کہ ختم ہوا بلکہ رسالت کی تکمیل بھی ہوئی۔

تکمیل رسالت

تکمیل رسالت دراصل ختم رسالت کا عنوان ہے..... اس لئے کہ جو چیز مکمل ہو چکی اور اس کا کوئی پہلو تشہ نہیں رہا تو اب اس سلسلے کو آگے چلانے کی ضرورت باقی نہیں رہی..... اس لئے حضرت محمد ﷺ کی ذات گرامی ختم رسالت بھی ہے اور تکمیل رسالت بھی اور یہ آپ کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جو آپ ﷺ کو تمام نبیوں کے مقابلہ میں شانِ فضیلت عطا کرتی ہے۔

تکمیل رسالت کو اگر ہم ذرا وضاحت کے ساتھ سمجھنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایسا آئین اور نظامِ فکر و عمل جو ہر زمانہ کے لئے اور تمام عالمِ انسانیت کے لئے تا قیامت کافی و شافی ہو، ہر پہلو سے وہ اتنا مکمل، اتنا جامع، اتنا جاندار ہو، کہ شب و روز کی گردشیں اس کو کہنہ نہ کر سکیں..... زمانے کے انقلابات کتنے بھی آجائیں، مگر وہ دستورِ زندگی اسی طرح شاداب اور تروتازہ رہے اور اس میں کسی کمی بیشی کی، کسی ترمیم کی قیامت تک کوئی ضرورت پیش نہ آئے..... حضرت محمد ﷺ کی ذات گرامی اپنے کردارِ عمل کے اعتبار سے اس درجہ مکمل اور بے غبار ہے کہ ہر زمانہ کے لوگ اگر کسی شخصیت کو زندگی کے تمام گوشوں کے لئے اپنے لئے مثال اور نمونہ بنانا چاہیں، تو ان کی نگاہیں حضرت محمد ﷺ کے علاوہ کسی اور کو دیکھ نہیں سکتیں، سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ آپ ﷺ کی زندگی کے حالات، ولادت سے لے کر وفات تک، اس طرح روشن ہیں کہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا کوئی گوشہ زمانے کی نگاہوں

سے مخفی نہیں ہے..... عالم یہ ہے کہ وہ معاملات جن کا تعلق گھر کی تنہائیوں سے ہے، ان خلوتوں سے ہے جہاں فرشتے بھی داخل نہیں ہو سکتے وہ بھی اس طرح اجاگر ہیں کہ ہماری خلوتوں کے لئے اگر کوئی نمونہ ہے تو نبی ﷺ کی خلوت ہے..... ہماری جلوتوں کے لئے کوئی مثال ہے تو حضرت محمد ﷺ کی جلوتیں ہیں۔ پھر ان تمام حالات کو دیکھنے والی، سننے والی اور اپنے اندر جذب کر لینے والی وہ محبوب ہستیاں ہیں جو آپ ﷺ کی ایک ایک نقل و حرکت کو نہ صرف یہ کہ غور سے دیکھ رہی ہیں اور اس کو محفوظ کرتی چلی جا رہی ہیں بلکہ اس سانچے میں اپنی زندگیوں کو ڈھال رہی ہیں..... صحابہ کرام جو پروانوں کی طرح آپ ﷺ پر غار ہیں ان کو دیکھئے..... کوئی آپ ﷺ کے اخلاق کا اعلیٰ نمونہ بنا ہوا ہے..... کوئی آپ ﷺ کے زہد و تقویٰ کی جلوہ گری کو نمایاں کر رہا ہے..... کوئی آپ ﷺ کے انداز عبادت کا اظہار کر رہا ہے..... کوئی آپ ﷺ کے انداز حکمرانی، کوئی آپ ﷺ کی مروت اور آپ ﷺ کے حسن تدبیر کی جلوہ گری کر رہا ہے..... کوئی آپ ﷺ کو عدل و انصاف اور مساوات کی صفت کا نمونہ بنا ہوا ہے..... اور کوئی آپ ﷺ کی شجاعت اور آپ ﷺ کی جود و سخا کی عادتوں کو نمایاں کر رہا ہے۔ غرضیکہ حضرت محمد ﷺ کی ذات گرامی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہ اجمعین کے لئے اس طرح سرچشمہ نور و ہدایت بنی ہوئی ہے کہ ہر صحابی آپ ﷺ کے ایک ایک انداز کو اپنے اندر سموئے چلا جا رہا ہے، اور اپنی زندگی کو اس سانچے میں ڈھال رہا ہے..... یعنی ایسا تصور کر لیجئے کہ حضرت محمد ﷺ کی سیرت اور عادتوں کو پھیلایا جائے تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک جماعت بن جاتی ہے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت کو سمیٹا جائے تو حضرت محمد ﷺ کی سیرت کا نمونہ بن جاتی ہے۔

یہ اتنا اہتمام اور انتظام اللہ تعالیٰ کی طرف سے کس لئے ہے؟ اس لئے کہ اس نمونہ کو قیامت تمام انسانوں کے لئے ایک مثال کے طور پر باقی رکھنا ہے..... یہ تو ہے رحمت اللعالمین ﷺ کی ذات گرامی کا معاملہ، پھر جو پیام رحمت وہ پیش کر رہے ہیں اور اپنے عمل سے لوگوں کے سامنے لا رہے ہیں وہ اس درجہ حکیمانہ اور معتدل اور متوازن ہے کہ ہر طرح کے لوگ ہر زمانہ میں اس کو اختیار کر سکتے ہیں..... کسی بھی زمانہ میں کوئی بھی مسئلہ پیش آئے

اس کو حل کرنے کے لئے کافی ہے کہ انسان سیرت نبوی ﷺ سے رہنمائی حاصل کرے۔
 اس طرح کا محفوظ، مکمل، جامع، معتدل آئین زندگی اور دستور حیات پیامِ رحمت
 اللعالمین کے سوا اور کون سا ہو سکتا ہے..... حقیقت ہے کہ رب العالمین کی ربوبیت کا مظہر اتم
 رحمت اللعالمین ﷺ ہیں اور یہ لقب جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کو عطا ہوا ہے کہ
 ”وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ“ (الانبیاء: ۱۰۷) اور ہم نے آپ کو دنیا جہاں پر (اپنی)
 رحمت ہی کے لئے بھیجا ہے آپ ﷺ اس کے ہر طرح سرسوار ہیں۔

ان مجلسوں میں جو اس پیامِ رحمت کے لئے منعقد کی جا رہی ہیں آپ ﷺ کی زندگی کے
 مختلف گوشے آپ کے سامنے آئیں گے۔ دنیائے انسانیت کو آج اس پیامِ رحمت کی ضرورت
 سب سے زیادہ ہے..... اس لئے کہ دنیا آج اپنی مادی ترقیات کے باوجود تباہی کے دہانے پر کھڑی
 ہوئی ہے۔ اگر رحمت کا یہ پیغام اس تک نہ پہنچا تو شاید وہ تباہی سے نہ خود بچ سکے گی اور نہ بچا سکے گی۔
 اور اس کی ذمہ داری سے غلامانِ محمد ﷺ بھی بری الذمہ نہیں ہو سکیں گے اگر انہوں نے
 اس پیامِ رحمت کو ہر جگہ پہنچانے کے لئے اپنی توانائیوں کو خلوص نیت کے ساتھ صرف نہ کیا۔

یہ بھی جہاد ہے اور بہت بڑا جہاد ہے کہ ان اندھیروں میں جب کہ اہل حق پر دہشت
 گردی، بنیاد پرستی اور دوسرے بے جا الزامات لگا کر سچائی کا راستہ روکنے کی کوشش کی جا رہی
 ہے۔ اہل ایمان اس طرح کے تمام الزامات کو نظر انداز کرتے ہوئے سچائی کا یہ پیغام اور رحمت
 کا یہ اعلان دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچادیں کہ اے انسانوں! تمہاری نجات اس میں ہے کہ
 تم اس نظام کو اپنالو جو انسانوں کو انسانوں کا خدا بننے سے روکتا ہے..... جو طاقتور کو کمزور کی
 نگہبانی اور حفاظت سکھاتا ہے..... جو تمام انسانوں میں مساوات اور برابری پیدا کرتا ہے۔

اگر تم دنیا میں امن و امان کے خواہاں ہو تو امن کا راز کسی انسان پر کسی دوسرے انسان کی
 بالادستی میں، یا کسی قوم کی دوسری قوم کے غلبے میں، یا کسی ملک کی دوسرے ملک کو فتح کرنے
 میں نہیں ہے، بلکہ امن اور کامیابی کا راز اس میں ہے کہ انسان اپنے رب کو رب مان کر اس کا
 بندہ بن کر رہے۔

فرصت کی ان ساعتوں کو غنیمت سمجھ کر رحمت اللعالمین ﷺ کے پیامِ رحمت کے کچھ

گوشتوں پر نگاہ ڈالتے چلیں اور اس کو اپنے فکر و عمل میں ڈھالنے کی کوشش کریں.....

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ

ان تو سبھی خطبات کا مرکزی عنوان ہے ”نبی رحمت ﷺ کا پیام رحمت“ اور اس

مرکزی عنوان کے تحت پانچ خطبے ہیں..... جن میں

پہلا خطبہ :- نبی رحمت ﷺ — عالم انسانیت کی سب سے بڑی ضرورت۔

دوسرا خطبہ :- نبی رحمت ﷺ — کیا ان کے بغیر انسانیت منزل نجات پا سکتی ہے؟

تیسرا خطبہ :- نبی رحمت ﷺ کی تعلیم و تربیت میں توازن اور حسن اعتدال۔

چوتھا خطبہ :- نبی رحمت ﷺ کے پیام میں دل سوزی، درد مندی، عالم انسانیت کی ہمدردی۔

پانچواں :- نبی رحمت ﷺ کا پیام، کامل اور دائمی پیام۔

ان تمام خطبات میں مرکزی حیثیت نبی رحمت ﷺ کے عنوان کی ہے۔ نبی رحمت

ﷺ جن کو بارگاہ الہی کی طرف سے خصوصی امتیاز کا وہ تمغہ عطا ہوا جو حضرت آدم علیہ السلام

سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے بھی محترم انبیائے کرام علیہم السلام اللہ کی

طرف سے منتخب اور مقرر کئے گئے ان میں سے کسی کو بھی اس خاص لقب سے سرفراز نہیں کیا

گیا..... ارشاد ہوا ہے ”وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ“ (الانبیاء: ۱۰۷) اور اے

محمد ﷺ ہم نے نہیں بھیجا تم کو مگر تمام عالموں کے لئے رحمت بنا کر)..... رحمت اللعالمین وہ

خطاب اور لقب ہے جو صرف اور صرف خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو بارگاہ الہی

سے عطا ہوا ہے۔ تمام عالم کے لئے بلکہ عالمین کے لئے یعنی جتنے بھی عالم ہیں ان سب کے

لئے وہی ذات باعث رحمت ہوگی جس نے دنیا والوں کی بھلائی، خیر خواہی، ان کی ترقی اور ان کی

فلاح و صلاح کے لئے اپنی پوری زندگی کو وقف کر دیا ہو..... جس نے زندگی کے ایک گوشہ

میں نہیں، بلکہ انسانوں کی پوری زندگی میں ایسا عظیم انقلاب برپا کیا ہو کہ اس سے بڑھ کر کسی

اور انقلاب کا تصور بھی نہ ہو سکے..... جس نے نہ صرف دلوں کو پاک اور روحوں کو روشن کیا

ہو، بلکہ عقل و خرد کی گتھیوں کو بھی اپنے ناخن حکمت سے سلجھا دیا ہو..... جس نے بندے کا

تعلق خدا سے جوڑا ہو اور دنیا اور آخرت دونوں جہاں کی کامیابی کا نہ صرف یہ کہ راستہ بتایا ہو بلکہ اس پر خود عمل کر کے ایک مثالی نمونہ اور اعلیٰ درجہ کا اسوۂ حسنہ دنیا کے سامنے رکھ دیا ہو..... جس کی تعلیم نے، جنگ و جدل اور خون انسانی میں ڈوبی ہوئی دنیا کو امن کا راستہ دکھایا ہو..... جس نے غریبی اور امیری، جوانی اور بڑھاپے، فقیری اور بادشاہی، غم اور مسرت، رنج و راحت ہر ہر مقام پر انسان کی رہبری کی ہو..... جس کی تعلیم نے تہذیب و تمدن کی اس بلندی کو چھوا ہو کہ اس سے زیادہ بلندی کا تصور نہ ہو سکتا ہو..... جس نے غلاموں کو حکمرانی، حکمرانوں کو جہاں بانی سکھائی ہو..... جس نے علم و معرفت کے ان خزانوں تک عالم انسانیت کو پہنچایا ہو جن سے انسان آج تک بے خبر تھا..... جس کے اخلاق نے خود غرضی کو درد مندی میں، نفرت کو محبت میں، فرقہ پرستی کو اخوت میں بدل دیا ہو..... جس نے بتایا ہو کہ جانی دشمن کس طرح جگری دوست بن جاتا ہے..... جس کے صدق، امانت، صبر اور خاکساری نے انسانیت کا رتبہ آسمان سے بھی بلند کر دیا ہو..... جس نے قوموں کی بے گانگی کو یگانگت سے، رنگوں کے اختلاف کو اخوت سے، زبانوں کے فرق کو محبت سے بدل دیا ہو..... اور سب کو ایک کلمہ جامع اور ایک مرکز سے اس طرح جوڑ دیا ہو کہ عالم انسانیت ایک خاندان کی صورت میں نظر آنے لگے وہ ذات اقدس جو ان صفات سے متصف ہو اسی کا لقب رحمت اللعالمین ہو سکتا ہے۔

قرآن مجید میں ”العالمین“ کا لفظ مختلف آیتوں میں مختلف چیزوں کے لئے استعمال ہوا ہے..... مثلاً ارشاد ہے:

إِنَّ هُوَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْعَالَمِينَ (یعنی قرآن) تو بس ایک نصیحت ہے (دنیا)

(الانعام: ۹۱)

جہاں والوں کے لئے۔

وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ یہ قرآن نصیحت ہی نصیحت ہے، دنیا جہاں

(القلم: ۵۲)

والوں کے لئے

مذکورہ آیتوں میں ”عالمین“ کے ساتھ ”ذکر“ کا لفظ آیا ہے اور نبی ﷺ کے لئے ارشاد ہوا ہے فذکر انما انت مذکور (الغاشیہ: ۲۱)۔ تو آپ نصیحت کر دیا کیجئے آپ تو صرف نصیحت ہی کرنے والے ہیں) اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام عالم کے لئے مذکر اور یاد دہانی کرانے

والے حضرت محمد ﷺ ہیں اور ذکر سے مراد قرآن مجید ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام عالم کے لئے ہدایت کا ذریعہ قرآن مجید ہے اور اس ہدایت کے پہنچانے والے تمام عالم کے لئے حضرت محمد ﷺ ہیں قرآن مجید میں ایک جگہ ارشاد ہے :

إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ ایسی سر زمین کی طرف جس کو ہم نے دنیا جہان والوں کے واسطے بابرکت بنایا ہے۔ (الانبیاء: ۷۱)

اور فرمایا :

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ۔ (آل عمران: ۹۶) گیا وہ ہے جو مکہ میں ہے (سب کے لئے)

برکت والا اور سارے جہان کے لئے راہنما ہے

یہ دونوں آیتیں بیت المقدس اور بیت الحرام کے لئے ہیں برکت کا لفظ بیت المقدس کے لئے اور مسجد حرام دونوں کے لئے ہے اور ہدی کا لفظ بیت الحرام کے لئے ہے۔ یہ دونوں ہی مقامات اہل اسلام کے لئے ادب اور احترام کے ہیں۔ خود نبی ﷺ نے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی ہے اور پھر قبلہ کی تبدیلی کے حکم کے بعد بیت الحرام کو قبلہ بنایا گیا۔ امت محمدیہ کے علاوہ کوئی اور امت ان دونوں مقامات کو یکساں طور پر باعث احترام نہیں سمجھتی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (الاعراف: ۱۵۶) اور میری رحمت تو ہر چیز پر پھیلی ہوئی ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت کاملہ کا مظہر اتم رحمۃ للعالمین ہیں اس لئے آپ ﷺ کی نبوت اور رسالت بھی تمام عالم کے لئے ہے آئیے آئندہ صفحات میں رحمۃ اللعالمین ﷺ کی پاک زندگی کے کچھ گوشوں کی جھلک دنیا کے سامنے رکھنے کی کوشش کریں۔

پہلا خطبہ



نبی رحمت ﷺ عالم انسانیت کی
سب سے بڑی ضرورت۔

۵۱ ”زندگی کے مقصد کی رہنمائی اور یہ جاننا کہ انسان دنیا میں کیوں آیا ہے، انسان کی سب سے بڑی، اہم اور بنیادی ضرورت ہے، اور اللہ کی طرف سے اس رہنمائی اور ہدایت کا ذریعہ صرف پیغمبر ہے،

قرآن اور رسول ﷺ نے انسان کو ان کی حقیقی قدر و قیمت سے آگاہ کیا اور حقیقت یہ ہے کہ قرآن اور رسول ﷺ کی تعلیم نے ہی وحدت انسانی، مساوات و جمہوریت اور آزادی کے تخیلات پیدا کئے۔“



انسان کو دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لئے بہت سی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے..... ہوا، پانی، بدن کے لئے غذا، سانس لینے کے لئے ہوا اور اس طرح کی کتنی ہی بنیادی ضرورتیں ہیں جن کے بغیر انسان کا اس زمین کے اوپر زندہ رہنا ممکن نہیں ہے..... پیدائش سے لے کر موت تک قدم قدم پر زندگی کے لوازمات کی اور زندگی کی حفاظت کے سامان کی ضرورت پیش آتی ہے..... پروردگار عالم نے انسان کو زمین پر بھیجتے ہوئے بتا دیا تھا کہ

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ تمہارے لئے زمین پر ٹھکانہ ہے اور زندگی کا

(البقرہ : ۳۶) سامان مہیا ہے ایک مقررہ مدت تک

اس وعدہ الہی کے مطابق انسان نے جب زمین پر قدم رکھا تو اس نے زندگی کے سامان زمین پر موجود پائے..... پروردگار نے انسان میں عقل و فہم کی ایسی قوت رکھی ہے کہ جیسے جیسے اس کی آبادی زمین پر بڑھتی گئی تمدن میں ترقی ہوتی گئی، ضروریات میں اضافہ ہوتا گیا، اسی کے مطابق انسان اللہ کی بنائی ہوئی چیزوں کو نیا روپ دیتا گیا اور اپنی ضرورتیں پوری کرتا گیا..... کبھی وہ جنگلوں میں رہتا تھا، غاروں میں بسر کرتا تھا..... پتوں سے بدن کو ڈھانپتا تھا، جنگلی پھلوں پر گزارا کرتا تھا..... وہی انسان اپنی عقل و فہم قوت اور اک و ایجاد سے کام لے کر اس زمین کو سجااتا چلا گیا..... اس کی زندگی آسان سے آسان اور خوبصورت سے خوبصورت ہوتی چلی گئی..... بروجہ میں اس کی قوت تسخیر اور نت نئی ایجادات کے ذریعے اس کے ہنر کے کمال کا اظہار ہوتا گیا۔ آج انسان ستاروں سے آگے جہانوں کی خبر لارہا ہے، فاصلے سمٹ گئے ہیں، براعظم ایک شہر کے محلوں کی طرح بن گئے ہیں..... تمدن کی ترقی اور ذرائع ابلاغ کی بلندیوں نے انسانی زندگی کو ایک نیا رخ دے دیا ہے.....

لیکن ان تمام ترقیات کے باوجود عقل و فہم کی گرہ کشائیوں کے باوصف ایک سوال ایسا

ہے جس کا جواب معلوم کئے بغیر چارہ نہیں اور جواب معلوم کرنے کا انسان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں..... انسان کے پاس کسی چیز کے معلوم کرنے کے ذرائع یا تو حواس خمسہ ہیں یا اس کی عقل و فہم ہے..... حواس خمسہ میں کوئی چیز آنکھ سے دیکھ کر معلوم ہوتی ہے جیسے ہم رنگوں کا امتیاز دیکھ کر کرتے ہیں۔ کسی چیز کا پتہ کانوں سے سن کر لگتا ہے، جیسے آواز ہم کانوں سے سن کر معلوم کرتے ہیں..... کسی چیز کا پتہ چکھ کر لگتا ہے، زبان میٹھے کڑوے کے فرق کو بتاتی ہے..... کسی چیز کو ہم کو چھو کر معلوم کرتے ہیں، سختی نرمی، گرم، ٹھنڈا چھو کر معلوم ہوتا ہے۔ خوشبو اور بدبو کا پتہ لگانے کے لئے پروردگار نے ناک دی ہے..... کچھ چیزیں جو حواس خمسہ سے معلوم نہیں ہو سکتیں ان کا پتہ عقل و فہم سے لگتا ہے..... جیسے عقل ہمیں بتاتی ہے کہ ہم مخلوق ہیں تو ہمارا کوئی خالق بھی ضرور ہوگا۔ ہم بیٹے ہیں تو ہمارا باپ بھی ضرور ہونا چاہئے اور ماں بھی ہونی چاہئے..... اسی طرح تجربات اور مشاہدات سے بھی نئے انکشافات ہوتے ہیں..... یہ بھی معلومات کا ایک ذریعہ ہے۔

سوال پھر وہی سامنے آتا ہے جس کا جواب معلوم ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا انسان کا زندہ رہنا۔ وہ سوال یہ ہے کہ دنیا میں انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ پروردگار نے اسے دنیا میں کیوں بھیجا ہے؟ موت و حیات کا یہ سلسلہ جو دنیا کے آغاز سے جاری ہے یہ کیوں ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ جس کے جواب سے انسان کی پوری زندگی کا تعلق ہے اگر اس سوال کا جواب معلوم نہ ہو تو ساری زندگی بے مقصد، فضول اور بیکار ہو کر رہ جاتی ہے..... اتنا اہم اور ضروری سوال، مگر اس کا جواب معلوم کرنے کا ذریعہ نہ انسان کے حواس خمسہ ہیں اور نہ اس کی مایہ ناز عقل و فہم ہے..... نہ تجربات و مشاہدات ہیں۔

اگر دنیا کے سارے دانشور اور مفکرین ایک جگہ جمع ہو جائیں اور اس سوال کے جواب پر غور کرنے کے لئے اپنی پوری علمی طاقت اور عقل کی قوت لگا دیں تب بھی وہ اس کا جواب معلوم نہیں کر سکتے..... اس سوال کا جواب صرف اسی کے پاس ہے جس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ جو اس کا خالق اور پروردگار ہے، جو اپنی مخلوق پر بے حد مہربان اور شفیق ہے۔ اس نے انسان کو دنیا میں بھیجنے کے ساتھ ہی اس سوال کے جواب کے لئے دو طرح کے انتظامات کئے۔

ایک انتظام اندر سے، داخلی انتظام، دوسرا انتظام باہر سے، بیرونی انتظام، تاکہ انسان پوری روشنی میں اس سوال کا جواب معلوم کر سکے اور سمجھ سکے جس طرح آنکھ کو دیکھنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے کہ آنکھ کے اندر بھی روشنی ہو جو باہر کی چیزوں کو دکھائے اور باہر بھی روشنی ہو تاکہ اندر کی آنکھ باہر کی چیز کو دیکھ سکے..... اگر کوئی شخص نابینا ہے تو باہر کتنی بھی روشنی ہو اس کو کچھ نظر نہیں آئے گا اور اگر کوئی شخص صاحبِ نظر ہے، بینا ہے، مگر باہر اندھیرا ہے تو بھی اسے کچھ سمجھائی نہیں دے گا، اندھیرے میں اندھوں کی طرح ٹٹولتا پھرے گا۔ تو جس طرح دیکھنے کے لئے اندر اور باہر روشنی کی ضرورت ہے اسی طرح اس سوال کا جواب معلوم کرنے، ہدایت کی راہ پانے اور صراطِ مستقیم پر چلنے کے لئے اندر اور باہر روشنی کی ضرورت ہے..... اندر کا انتظام پروردگار نے یہ کیا کہ انسان کی فطرت اور اس کی بناوٹ ایسی سلیم بنائی کہ وہ نیکی کو قبول کرتا ہے، نیکی کو پسند کرتا ہے، اس کی فطرت صحیح راستے پر چلنے کا تقاضہ کرتی ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (التین: ۴) ہم نے انسان کو بہترین انداز پر بنایا ہے

اس کا ظاہر بھی خوبصورت اور اس کی فطرت بھی سلیم ہے۔ ایک حدیث میں

حضور ﷺ نے قرآن پاک کے اسی مضمون کو اس طور پر بیان فرمایا ہے کہ

مَا مِنْ مَوْلُودٍ إِلَّا يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ (یعنی ہر بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے
فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ وَيُنَصِّرَانِهِ وَيُمَجْسِنَانِهِ پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا عیسائی یا
(مَنْ ابى هَريرة مسلم ۲ / ۳۳۶) آتش پرست بنادیتے ہیں۔

ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو خطاب کرتے ہوئے ان کے فرائضِ دعوت و تبلیغ کا ذکر کیا ہے وہاں لفظ تذکیر کا استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ (الغاشیة: ۲۱) تو آپ نصیحت کر دیا کیجئے، آپ تو صرف

نصیحت ہی کرنے والے ہیں۔

اور اسی طرح

إِنَّ هَذِهِ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ سَبِيلِهِ سَبِيلًا (الدھر: ۲۹) اختیار کرے۔

اور تذکیر اور ذکر کے معنی ہیں یاد دہانی کرنا یعنی وہ بات اور وہ سبق جو انسان پڑھ چکا ہے مگر بھول گیا اس کو یاد دلانا ہے وہ چیز اندر موجود ہے، باہر سے کوئی نئی چیز اندر داخل کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہی چیز جو پہلے سے فطرت میں موجود ہے اسی کو ابھارنا ہے..... معلوم ہوا کہ انسان اپنی فطرت اور بناوٹ کے اعتبار سے اس چیز کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے جو اس کی زندگی کا حقیقی مقصد ہے..... جو چیز فطرت کے مطابق نہیں ہے اور باہر سے اس کو داخل کیا جائے فطرت اس کو قبول نہیں کرتی۔

اسی طرح آپ دیکھتے ہیں کہ اگر کسی کے جسم میں خون داخل کرنا ہو تو اسی گروپ کا خون ہونا چاہئے جو اس شخص کا بلڈ گروپ ہے..... اگر اس گروپ کے خلاف کوئی دوسرے گروپ کا خون اس کے بدن میں داخل کیا جائے گا تو جسم اس کو قبول نہیں کرے گا اور اس سے بجائے فائدہ کے نقصان ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اصول فطرت یہ ہے کہ وہی چیز قابل قبول ہوگی جو فطرت سے ہم آہنگ ہو..... اگر کوئی باہر کی چیز ہو اور فطرت سے میل نہ کھائے، تو اوّل تو اس کو فطرت قبول نہیں کرے گی، اور اگر زور و زبردستی سے کام لیا جائے گا تو اس سے فائدہ تو کیا لانا نقصان ہوگا۔

ایک ڈاکٹر صاحب سے ایک مریضہ کے بارے میں (جن کے گردے جواب دے چکے تھے) میری تفصیل سے بات چیت ہوئی..... تجویز یہ تھی کہ کوئی گردہ لے کر مریضہ کے بدن میں لگا دیا جائے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے جو باتیں بتائیں وہ بڑی قابل غور ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ انسان کا بدن کچھ اس طرح سے بنا ہے کہ وہ باہر کی کسی چیز کو قبول نہیں کرتا۔ اب ہم جب مریض کا گردہ بدلتے ہیں اور کوئی دوسرا گردہ لگاتے ہیں تو حقیقت میں نہ بدن ہی اس کو قبول کرتا ہے اور نہ وہ گردہ کسی غیر کے بدن میں رہنا چاہتا ہے۔ اب جب اس کو فٹ کر دیا جاتا ہے تو ایسی دوائیں دی جاتی ہیں جس سے گردے کو محسوس نہ ہو کہ میں کسی غیر کے بدن میں ہوں، اور بدن کو پتہ نہ چلے کہ کوئی دوسرا گردہ اس میں لگایا گیا ہے۔ اس طرح کی دواؤں کے ذریعے دونوں کو بے خبر رکھ کر گردے سے خدمت لی جاتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی اس تشریح سے یہ اصول پوری طرح کھل کر سامنے آیا کہ فطرت ان چیزوں کو قبول کرتی ہے جو اس فطرت سے ہم آہنگ ہوں۔ حقیقت یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت سلیم بنائی ہے۔ اگرچہ بہت سے دانشور یہ کہتے ہیں کہ انسان کی فطرت سادہ کاغذ کی طرح ہے اس پر چاہے اچھی باتیں لکھ لویا بری باتیں۔ اچھی باتیں لکھنا فطرت کو اچھا بنادیتا ہے اور بُری باتیں لکھنا فطرت کو بگاڑ دیتا ہے۔

دانشوروں کا ایک طبقہ وہ بھی ہے جو یہ کہتا ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے بُرا ہے۔ البتہ اس کی تربیت کر کے اس کو اچھا بنایا جاسکتا ہے۔

اس طرح فطرت انسانی کے بارے میں ہمارے سامنے تین باتیں آتی ہیں۔

(۱) انسان کی فطرت سلیم ہے۔

(۲) انسان کی فطرت سادہ کاغذ کی طرح ہے جس پر کچھ لکھا ہوا نہیں ہے۔

(۳) انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے بُرا ہے البتہ اس کو اچھا بنایا جاسکتا ہے۔

قرآن مجید کا دعویٰ ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے سلیم ہے..... چنانچہ سورۃ التین میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا.....

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ہم نے انسان کو بہترین انداز سے بنایا ہے۔

(التین : ۴)

احسن تقویم سے مراد انسان کی سیرت اور صورت دونوں کا خوب ہونا ہے..... قرآن

مجید کا یہ دعویٰ ہے اور دعویٰ کی دلیل ان آیتوں میں بیان ہوئی ہے کہ.....

وَالْيَقِينِ وَالزُّيْتُونِ وَ طُورِ سِينِينَ وَ هَذَا قِسم ہے انجیر اور زیتون کی اور طور سینہ کی اور البلد الامین (التین : ۳، ۱) اس امن والے شہر کی۔

”الَّتَيْنِ“ کے معنی انجیر کے ہیں..... مراد ہے وہ سر زمین جہاں انجیر بکثرت پیدا ہوتا ہے.....

یعنی شام اور دمشق کے وہ علاقے جہاں اللہ تعالیٰ کے بہت سے پیغمبر پیدا ہوئے اور اس سر زمین کو اپنے کردار و عمل سے روشن کیا۔

اسی طرح ”طور سینین“ جہاں طور سینہ ہے، وہ علاقہ جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام

اور دوسرے پیغمبر پیدا ہوئے۔

”هذا البلد الامین“ بلد امین سے مراد مکہ مکرمہ ہے جہاں خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ مبعوث ہوئے۔

اس طرح قرآن اپنے دعوے کی یہ دلیل لاتا ہے کہ تم بُرے انسان کو دیکھ کر انسانوں کو بُرا کیوں سمجھتے ہو..... ان اچھے اور مثالی انسانوں کو دیکھ کر انسان کی فطرت کی خوبیوں کا اندازہ کیوں نہیں کرتے؟ بہر حال اس دعوے اور دلیل کے بعد ہم پورے اطمینان کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے اچھا بنایا گیا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ انسان جب اپنی فطرت کے اعتبار سے اچھا ہے تو پھر یہ بُرے کردار کہاں سے آتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ برائی اندر سے نہیں آتی بلکہ باہر سے اس کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے۔

جس طرح شیشہ اپنی اصل بناوٹ کے اعتبار سے شفاف ہوتا ہے..... اوپر سے مٹی وغیرہ آکر اس کو میلا اور دھندلا کر دیتی ہے۔ گرد و غبار اس کے اوپر سے آیا ہے اندر سے نہیں..... اندر سے وہی شفاف شیشہ ہے۔ اگر تربیت کے ذریعے اس کے میل پچیل کو صاف کر دیا جائے تو شیشے کی اصل فطرت جو اس کی چمک دکھ ہے جگمگا اٹھے گی۔

اسی طرح انسان کی فطرت شیشے کی طرح صاف اور شفاف ہے اور صرف اس چیز کو قبول کرتی ہے جو اس کی فطرت سے میل کھاتی ہے اب ہم ایک دوسری مثال سے اس بات کو سمجھتے اور سمجھاتے ہیں..... یہ آنکھیں جن سے ہم دیکھتے ہیں ان کو دیکھنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے..... ایک تو یہ کہ آنکھ میں دیکھنے کی صلاحیت ہو دوسرے یہ کہ اندرونی روشنی کے علاوہ باہر بھی روشنی ہو..... اگر آنکھ میں دیکھنے کی صلاحیت نہ ہو بینائی درست نہ ہو تو باہر کتنی بھی روشنی ہو اندھے کو اس روشنی سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

اور اگر آنکھ میں دیکھنے کی صلاحیت ہو، بینائی صحیح کام کرتی ہو، مگر باہر اندھیرا گھپ ہو، تو بھی آنکھ کی صلاحیت سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکے گا اور کچھ نظر نہ آئے گا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لئے دونوں طرح کے انتظام کئے ہیں..... ایک تو اس

کی فطرت سلیم بنائی ہے تاکہ وہ حق و صداقت کو قبول کر سکے اور اپنے اندر جذب کر سکے..... دوسرے باہر سے ہدایت کا انتظام اس طرح کیا ہے کہ اپنی کتابوں اور پیغمبروں کے ذریعے انسان کے سامنے حق کو اچھی طرح واضح کر دیا، تاکہ اس کے مطابق اپنی زندگی ڈھال سکے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی کتابوں کے ساتھ اپنے پیغمبروں کو بھی بھیجا تاکہ وہ اللہ کا پیغام پڑھ کر سنائیں اور خود اس پر عمل کر کے بھی دکھائیں۔ اس طرح انسان کے کان اور اس کی آنکھ دونوں حق کو سن بھی سکیں اور دیکھ بھی سکیں۔

یہ واقعہ ہے کہ انسان کانوں سے نہیں آنکھوں سے بنتا ہے یعنی سننے سے زیادہ اس پر دیکھنے کا اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے آغاز سے اس کا اہتمام کیا ہے کہ کتاب کے ساتھ رسول ضرور بھیجا جائے۔ یہ تو ہوا ہے کہ نبی آئے اور کتاب نہیں آئی مگر یہ کبھی نہیں ہوا کہ کتاب آئے اور نبی نہ آئے۔

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کو پیغمبری کے منصب پر بھی فائز کیا اور ان کو اپنی ہدایت سے نوازتے ہوئے ہدایت کی کہ وہ اس طریقہ ہدایت کو اپنی آنے والی اولاد کو بھی بتائیں..... چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام پہلے انسان بھی تھے اور پہلے نبی بھی تھے انہوں نے اپنی اولاد کو جس طریقہ زندگی کی تعلیم دی وہ وہی ایک طریقہ زندگی ہے جس کا نام اسلام ہے..... ”إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ“ (آل عمران: ۱۹)۔ دین تو اللہ کے نزدیک بس ایک اسلام ہے (اسلام کی بنیادی تعلیم وہی تھی جو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو دی تھی، ”أَنْ لَا تَعْبُدُوا إِلَّا إِلَهًا“ (الإسراء: ۲۳)۔ دیکھ مت کسی کو معبود بنانا سوائے ایک اللہ کے جو تمہارا خالق پروردگار ہے) اور اس حیثیت سے وہی فرماں روائی کا مستحق ہے۔ اس کے ساتھ اس کی عبادت میں کسی اور کو کسی حیثیت سے شریک و سہیم مت کرنا، ورنہ یہ تمہارا خود اپنے اوپر بڑا ظلم ہوگا ”إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ“ (لقمان: ۱۳)۔ بیشک شرک بڑا بھاری ظلم ہے)

اس تعلیم کا دوسرا جز یہ تھا کہ جس ذریعہ سے یہ ہدایت انسانوں کو پہنچ رہی ہے اس پر اعتماد کیا جائے، اگر وہ ذریعہ قابل اعتماد نہ ہو تو اس کی دی ہوئی ہدایت پر بھی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا

ہے۔ اس لئے اس تعلیم کا دوسرا جز یہ تھا کہ رسول کو رسول مانا جائے اور اس پر ایمان لایا جائے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تعلیم کا تیسرا جزء جیسا کہ ”وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَ مَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ“ (سورہ الاسراء : ۲۳۔ اور تمہارے لئے زمین ہی پر ٹھکانا اور ایک میعاد تک نفع اٹھانا ہے) میں لفظ ”إِلَىٰ حِينٍ“ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کو دنیا میں ہمیشہ کے لئے نہیں بلکہ ایک مقررہ مدت کے لئے بھیجا گیا ہے، اس کا قیام اس دنیا میں عارضی ہے اور اس کا اصل ٹھکانہ عالم آخرت ہے۔ عالم آخرت میں جانے کے لئے ایک دروازہ ہے جس کا نام موت ہے..... موت کے دروازے سے گزر کر انسان دوسرے عالم میں داخل ہو جاتا ہے جس کے تمام مرحلوں برزخ، قیامت، حشر و نشر، حساب و کتاب، ان سب کو ملا کر آخرت کا لفظ بولا جاتا ہے۔ لہذا حضرت آدم علیہ السلام کی تعلیم کا تیسرا جزء یہ تھا کہ انسان آخرت پر یقین رکھے۔

حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ کی طرف سے دی ہوئی ہدایت اپنی اولاد کو پہنچاتے ہوئے بتایا کہ دنیا میں تمہارے آنے کا مقصد امتحان اور آزمائش ہے..... اس بات کا امتحان کہ نیکی اور بدی، اچھائی اور برائی، ہدایت اور گمراہی ان دونوں میں انسان اپنی مرضی، اپنی خواہش اور اپنے ارادے سے کس کو منتخب کرتا ہے ”وَهَذِيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ“ (البلد : ۱۰۔ اور ہم ہی نے اسے دونوں راستے بتلا دیئے) یہ صحیح راستہ ہے یہ غلط، اب انتخاب انسان کا ہے کہ وہ کس راستے کو چنتا ہے۔

صرف راستہ ہی نہیں بتایا گیا بلکہ راستے پر چلنے کا طریقہ بھی بتایا گیا اور صرف بتایا ہی نہیں گیا بلکہ اللہ کے رسولوں نے عمل کر کے بھی دکھایا۔

○ دنیا بستی گئی، آباد ہوتی گئی، بہت سے شہر اور ملک بن گئے، لوگ دور دور رہنے لگے، بہت سے قبیلے اور برادریاں بن گئیں۔ آدم علیہ السلام کی اولاد اپنے باپ کی تعلیم سے دور ہوتی گئی۔ اصل تعلیم کو بھلا کر نئے نئے نظریات نت نئے مذاہب بنا لئے گئے..... اس طرح انسان ایک مذہب اور ایک دین کے بجائے بہت سے مذہبوں کی بھول بھلیاں میں کھو گیا۔

ضرورت ہوئی کہ انسان کو اس کا بھولا ہوا سبق پھر یاد دلایا جائے..... ایک معلم یعنی نبی کے بعد دوسرا نبی بھیجا جائے..... انسان کو گمراہی سے بچایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو بھیجا..... انہوں نے آکر اسی تعلیم کا سبق پڑھانا شروع کیا جو تعلیم حضرت آدم

علیہ السلام اپنے رب کی طرف سے لے کر آئے تھے۔ مگر انسان دنیا میں آنے کے بعد اتنی جلدی اس سبق کو بھول گیا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی ساڑھے نو سو سال کی دعوت و تبلیغ کے بعد بھی بہت کم لوگ اپنی اصل کی طرف لوٹ سکے یہاں تک کہ خود حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا بھی اپنے والد پر ایمان نہ لایا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں ایک زبردست طوفان آیا جس میں انسانی آبادی کا بہت بڑا حصہ طوفان کی نذر ہو گیا۔ صرف وہی لوگ بچے جو حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی میں سوار ہو گئے تھے۔ حال کے زمانہ میں جو دی کے پہاڑ پر اس کشتی کی بازیابی نے قرآن کے بیان کی صداقت کو اور روشن کر دیا ہے بچے کچھ انسانوں کے ذریعے دوبارہ نسل انسانی کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسی لئے حضرت نوح علیہ السلام کو آدم ثانی یعنی دوسرا آدم بھی کہا جاتا ہے۔

پھر انسان کی ہدایت کے لئے لگاتار ہر زمانہ میں اللہ کے نبی آتے رہے ”لِکُلِّ قَوْمٍ هَادٍ“ (الرعد : ۷)۔ اور ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہوتا ہے (بھولا ہوا سبق یاد دلاتے رہے، کفر و شرک کے اندھیروں میں توحید کی شمع جلاتے رہے۔

تقریباً ساڑھے چار ہزار سال پہلے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً اکیس سو سال قبل عراق کے علاقے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے نبی منتخب ہوئے ان کا مقابلہ اس زمانہ کے بادشاہ نمرود سے ہوا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کی توحید اور دعوت کا مرکز مکہ شہر میں بیت اللہ کو بنایا۔ یہ اسی الہی ہدایت کا جو حضرت آدم علیہ السلام لیکر آئے تھے، پہلا عالمی مرکز اور پہلی عبادت گاہ تھی ”اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِمَکَہَ“ (آل عمران : ۹۶)۔ سب سے پہلا مکان جو لوگوں کے لئے وضع کیا گیا وہ ہے جو مکہ میں ہے) حضرت اقبال نے اس آیت کے مفہوم کو اپنے شعر میں بڑی خوبی سے ادا کیا ہے

دنیا کے بنگلے میں پہلا وہ گھر خدا کا ہم اس کے پاس ہیں وہاں ہمارا

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جو نبوت کا سلسلہ شروع ہوا، وہ خاندان اور نسل کے انداز میں آگے بڑھتا گیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چھوٹے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام نبی ہوئے پھر ان کے بعد ان کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام بھی نبی ہوئے۔ حضرت یعقوب

علیہ السلام کا دوسرا نام اسرائیل تھا..... ان کی نسل اور ان کے ماننے والے بنی اسرائیل کہلائے۔ بنی اسرائیل میں سے حضرت یوسف علیہ السلام مصر پہنچے اور حکومت کے اہم عہدے پر فائز ہو کر الٰہی احکام کے نفاذ اور دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے رہے..... سلسلہ نبوت بنی اسرائیل میں آگے بڑھتا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے پیغمبر تھے۔ اب یہ ہوا کہ ادھر تو بنی اسرائیل اپنے اصل مقام کو اور اپنے نبیوں اور رسولوں کی اصل تعلیم کو بھول کر انحطاط کا شکار ہوتے گئے..... کہاں تو بنی اسرائیل کو امامت اور رہنمائی کے منصب پر فائز کیا گیا تھا، کہاں تو ان کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ دنیا کو اللہ کی خالص ہدایت سے روشناس کرائیں..... خود بھی صراطِ مستقیم پر چلیں اور دنیا کو بھی سیدھے راستے پر چلائیں اور کہاں وہ ایسے بھٹکے کہ بقول شاعر ع

ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے

خود تو گمراہ ہوئے دوسروں کو بھی گمراہی میں مبتلا کیا۔ ایک طرف بنی اسرائیل کی یہ ضلالت و گمراہی تھی، دوسری طرف دنیا اپنے فکر کے اعتبار سے بلوغ کی اس منزل کو پہنچ چکی تھی، کہ اب ہر قبیلہ اور ہر علاقہ کے لئے الگ الگ نبی یا رسول مقرر کرنے کے بجائے پوری دنیا کے لئے ایک ہی رسول..... پیغمبر عالم منتخب کر لئے جائیں، اور ان کے ذریعے وہ مکمل تعلیم دنیا کو دی جائے کہ اب کسی مزید تعلیم و ہدایت کی ضرورت پیش نہ آئے..... تا قیامت وہی ایک رسول، وہی ایک کتاب، وہی ایک ہدایت پورے عالم کے لئے کافی ہو جائے..... حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ان کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام ذبیح اللہ کے سلسلہ نسب میں سے مکہ کے قبیلہ قریش اور خاندان بنی ہاشم میں حضرت عبداللہ ابن عبد المطلب اور حضرت آمنہ بنت وہب کے بیٹے حضرت محمد ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے خاتم الانبیاء، امام الانبیاء، پیغمبر عالم کے طور پر منتخب فرمایا۔ ”وَاللّٰهُ يَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ“ (الانعام: ۱۲۵) اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس کو اپنا رسول منتخب کرنا ہے (وہ حاکم مطلق ہے، مختار کل ہے، حکیم و داد دہ ہے، انسانی ضروریات سے خوب واقف ہے، اس کو کسی کے مشورے کی ضرورت نہیں ہے..... اس نے حضرت محمد ﷺ کو اپنا رسول منتخب کیا اور ان کو ”رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ“

کا خطاب عطا فرمایا ”وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ“ (الانبیاء: ۱۰۷)۔ اور ہم نے آپ کو دنیا جہان پر (اپنی) رحمت ہی کے لئے بھیجا ہے)

○ زندگی کے مقصد کی رہنمائی اور یہ جاننا کہ انسان دنیا میں کیوں آیا ہے، انسان کی سب سے بڑی، اہم اور بنیادی ضرورت ہے اور اللہ کی طرف سے اس رہنمائی اور ہدایت کا ذریعہ صرف پیغمبر ہیں۔

○ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ جس زمانہ میں تشریف لائے یہ چھٹی صدی عیسوی کا آخر تھا..... آپ ﷺ کی ولادت باسعادت ۲۲ اپریل ۵۷۱ء کی ہے۔ یہ زمانہ اخلاقی اعتبار سے اندھیری رات کی طرح تھا، جہاں دور دور تک کوئی دیالٹھٹا نظر نہیں آتا تھا۔..... مذہب اخلاقی قدروں کا امین ہوتا ہے..... مذہب اور اس کی تعلیم میں انسانی ہاتھوں کی کار فرمائیوں نے مذہب کا چہرہ اتنا بگاڑ کر رکھ دیا تھا کہ اس کی ٹھیک ٹھیک شکل پہچانی بھی مشکل تھی..... دنیا کے چاروں طرف نظر ڈالئے تو ہر ملک کی حالت اخلاقی اعتبار سے انتہائی پست اور گری ہوئی تھی۔

○ ایران جس کو اس زمانہ میں فارس کہتے تھے اس کا شمار ترقی یافتہ ملکوں میں ہوتا تھا.....

لیکن اس کی اخلاقی گراؤ کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ مزدک نے برسر دربار کسریٰ کی بانو کو بے عصمت کرنے کی فرمائش کی اور فرمانروائے ایران کو ذرا بھی غیرت نہ آئی.....

درندگی، بغض و حسد، دھوکہ دہی، فریب کاری جتنی اخلاقی خرابیاں تھیں دنیا کے اس ترقی یافتہ ملک کے لوگ اس میں مبتلا تھے۔ کمزوروں کو جانوروں سے بدتر کر دیا گیا تھا۔ علوم و فنون اور تہذیب کا یہ مرکز بدکرداری اور بدتہذیبی کی تارکیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

○ یہی حال دوسری سپر پاور روم و یونان کا تھا۔ مختلف علوم و فنون میں یونان کی ترقی کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ طب، ریاضی، منطق، فلسفہ، حکمت ہر علم و فن میں یونان دنیا میں سب سے آگے تھا۔ سقراط، بقراط، افلاطون، ارسطو جیسے دانشور اس ملک میں پیدا ہوئے، سکندر جیسا فاتح اعظم اس ملک سے اٹھا، قیصر جس کا دار السلطنت قسطنطنیہ تھا، نہ صرف شہنشاہ بلکہ دینی پیشوا سمجھا جاتا تھا۔ چھٹی و ساتویں صدی میں اس ترقی یافتہ ملک کی اخلاقی اور دینی حالت کیا تھی اس کا اندازہ اس سے لگالیجئے کہ انسانوں کی غلامی عام بات تھی۔ انسان جانوروں کی طرح

بیچے خریدے جاتے تھے..... آقا اپنے غلام کو اس طرح قتل کرنے کا حق رکھتا تھا جس طرح کوئی جانور کو ذبح کرنے کا حق رکھتا ہے۔ باپ اپنی اولاد کو بیچ ڈالتے تھے، غلاموں کو شادی کرنے کا کوئی حق نہ تھا، یہاں تک کہ غلاموں اور ان کی اولاد میں کوئی قانونی رشتہ نہ سمجھا جاتا تھا۔

○ شام، روم اور یونان میں عیسائی راہبوں کی انتہائی کثرت ہو گئی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ عورتوں میں بھی یہ رسم پھیلی۔ عیسائی خانقاہیں جو راہبوں اور راہبات کی قیام گاہیں تھیں شرمناک حرکتوں کا اڈہ بن گئیں..... بعض راہب جنگلوں میں رہتے تھے، چوری، زنا، فریب ایک عام بات تھی، توحید اور خدا پرستی کا نام و نشان نہ رہا تھا۔ مذہبی خداؤں کی خدمت کو جنت کی ضمانت سمجھا جاتا تھا، امیر لوگ غریبوں کو غلام بنا لیتے تھے، فوجی سپہ سالار رعایا کو جانوروں سے بدتر سمجھتے تھے۔ کاشتکاروں کی ساری محنت پر قابض ہو کر خود عیش کرتے تھے۔ غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کا کوئی اثر عیسائی حضرات میں نہ رہا تھا۔

○ مصر ایک زراعتی ملک ہے۔ ایران، روم اور یونان نے مصر پر بار بار حملے کئے اور ان حملوں کا اثر مصر کی تہذیب اور اس کے تمدن پر بھی پڑا ہے۔ عیسائی مذہب رومیوں کی حکومت کے زمانے میں مصر میں بھی پھیلا اور ایک قابل ذکر آبادی نے اس کو قبول کیا مگر مصر کے عیسائیوں اور بت پرستوں دونوں کی اخلاقی حالت انتہائی گری ہوئی تھی۔ غلامی، زناکاری، عارت گری عام تھی۔ انسان کا قتل تفریح کا سامان بن گیا تھا۔ عورتوں کو خودکشی کی ترغیب دی جاتی تھی۔ غرض تہذیب و شائستگی مصر سے رخصت ہو چکی تھی۔

○ ہندوستان کی حالت بھی دوسرے ملکوں سے مختلف نہ تھی..... اشوک، چندر گپت، مگراجیت بڑے بڑے نامور مہاراجے ہندوستان میں گزر چکے تھے، ریاضی، فلسفے پر ہندیوں کو ناز تھا، کرشن، رام چندر، گوتم بدھ جیسے مذاہب کے بانوں کی حکایتیں مہابھارت اور رام لیلہ کے رزمیہ افسانے ان کو یاد تھے، لیکن پانچویں چھٹی صدی عیسوی میں جب بدھ مذہب ہندوستان سے رخصت ہو رہا تھا اور برہمنی تہذیب زور پکڑ رہی تھی اس وقت کے ہندوستان کا حال یہ تھا کہ بامِ رامیوں کے حیا سوز مسک نے ملک کے ہر حصے میں مقبولیت حاصل کر لی تھی، زناکاری کے لئے اصول و قواعد مقرر ہو کر مذہب میں داخل ہو گئے تھے۔

سندھ کے راجاؤں میں ایسی مثالیں موجود تھیں کہ انہوں نے حقیقی بہنوں سے شادیاں کیں، اخلاقی پستی اور معاشرت قابل شرم حد تک گر چکی تھی، بتوں کے علاوہ ستاروں، پہاڑوں، دریاؤں، درختوں، حیوانوں، سانپوں یہاں تک کہ شرم گاہوں کی پوجا ہوتی تھی۔

○ چین میں کنفیو شس، تاو اور بدھ، ان تینوں تہذیبوں کے ملاپ نے ملک میں شورش پیدا کر دی تھی، چین کی اخلاقی اور معاشرتی حالت بد سے بدتر ہو چکی تھی۔

یہی حال روس، برما، ترکستان اور یورپ کے ملکوں کا تھا۔ غرض نبی ﷺ کی بعثت سے پہلے اور بعثت کے وقت پوری دنیا جہالت کی تاریکی میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے، دنیا پر ایسا وقت اس سے پہلے شاید ہی آیا ہو کہ پوری دنیا تہذیب، تمدن اور اخلاق، علم و حکمت، معرفت الہی ان تمام خوبیوں سے ایک ہی وقت میں خالی ہو کر رہ جائے اور کہیں کوئی روشنی نظر نہ آئے۔

ان حالات کو سامنے رکھئے اور اندازہ لگائیے کہ محمد رسول ﷺ کی تعلیم اور ان پر اتاری گئی اللہ کی کتاب قرآن نے دنیا کے تصورات و افکار میں کیسا انقلاب برپا کر دیا، اور صرف ۲۳ سال کی تھوڑی سی مدت میں دنیا کیا سے کیا ہو گئی۔

○ آپ ﷺ نے وہم پرست دنیا کا رخ عقلیت کی طرف کر دیا۔

○ عجبہ پرستی کو حقیقت پسندی میں بدل دیا۔

○ رہبانیت کا رخ پرہیز گارانہ سماجی زندگی کی طرف موڑ دیا۔

○ خرق عادات میں گم رہنے والوں کو آثارِ فطرت میں اللہ کی نشانیاں ڈھونڈنے کا خوگر بنادیا۔

○ خیالی گھوڑے دوڑانے والوں کو فکر و نظر اور مشاہدے اور تحقیق کے راستے پر لگادیا۔

○ قرآن اور رسول نے عقل، حس، وجدان کی امتیازی حدیں بتائیں۔

○ مادیت اور روحانیت میں تناسب اور توازن پیدا کیا۔

○ دین سے علم و عمل کا اور علم و عمل کا دین سے ربط پیدا کیا۔

یہ قرآن اور رسول ﷺ کی تعلیم ہی کا اثر ہے کہ مذہب کی طاقت سے سائنٹفک

اسپرٹ اور سائنٹفک اسپرٹ سے دینداری پیدا کی۔

○ مخلوق پرستی کی بنیاد کو اکھاڑ پھینکا۔

○ قرآن اور رسول ﷺ نے اخلاق اور روحانیت کے سارے تصورات بدل ڈالے جو لوگ ترک دنیا اور نفس کشی کو عین اخلاق سمجھتے تھے، جن کے نزدیک نفس اور جسم کے حقوق ادا کرنے اور دنیا کی زندگی کے معاملات میں حصہ لینے کے ساتھ روحانی ترقی اور نجات ممکن ہی نہ تھی ان کو قرآن اور رسول ﷺ نے تمدن، سماج اور دنیاوی عمل کے اندر فضیلت اخلاق، روحانی ترقی اور حصول نجات کا راستہ دکھایا۔

○ قرآن اور رسول ﷺ نے انسان کو ان کی حقیقی قدر و قیمت سے آگاہ کیا جو لوگ ہر طاقتور انسان کو معبود کی جگہ دے دیتے تھے ان کو بتایا کہ انسان انسان کے سوا کچھ نہیں کوئی شخص تقدس، عسکرانی اور آقا کی کا پیدائشی حق لے کر نہیں آیا اور نہ کسی انسان پر ناپاکی، محکومیت اور غلامی کا پیدائشی داغ لگا ہوا ہے۔

○ حقیقت یہ ہے کہ قرآن اور رسول کی تعلیم نے ہی وحدت انسانی اور مساوات و جمہوریت اور آزادی کے تخیلات پیدا کئے۔

آپ ﷺ کی تعلیم اور کوشش سے دنیائے انسانیت میں جو عظیم انقلاب برپا ہوا اور انسان نے صحیح معنی میں اپنے مقام کو جانا اور سمجھا اس کی روشنی میں یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ عالم انسانیت کی سب سے بڑی ضرورت اور دنیائے انسانیت کے سب سے بڑے محسن ہیں، آپ ﷺ نے زندگی بھر اپنے لئے نہ کچھ مانگا اور نہ کچھ چاہا، وہ ایسے ابر رحمت تھے کہ وہ زمین پر بر سے تو زمین لہلہا اٹھی، سرسبز و شاداب ہو گئی اور آج جہاں کہیں نیکی اور اخلاق کی روشنی نظر آتی ہے وہ اسی نور نبوت کا فیضان ہے۔

ترا پیام خدا کا ہے آخری پیغام سنانہ پھر کوئی پیغام اس پیام کے بعد
میری زبان پہ ہے نام محمدؐ عربی ہر ایک گام سے پہلے ہر ایک گام کے بعد

اللهم صل علی محمد عبدك و رسولك النبی الامی و علی آلہ و صحبہ و
سلم تسلیما كثيرا کثیرا سبحان ربك رب العزة عما یصفون و سلام علی
المرسلین و الحمد لله رب العالمین -

دوسرا خطبہ

نبی رحمت ﷺ — کیا ان کے بغیر
انسانیت منزلِ نجات پاسکتی ہے؟

۴۳ ” آج دنیا بڑی تیزی کے ساتھ ایک عالمی نظام کی طرف بڑھتی چلی جا رہی ہے، وہ عالمی نظام کیا ہو، اس کے خدو خال کیسے ہوں، تاریخ میں ہے کوئی ایسا نمونہ جو اس عالمی نظام کے لئے مثال کا کام دے سکے، جو پوری دنیا کے انسانوں کو ایک کنبہ کی صورت میں جوڑ سکے، جو دنیا کی تمام قوموں کو انصاف دلا سکے، جو ہر طرح کے بھید بھاؤ کو مٹا کر پوری دنیا کے انسانوں کو ایک مرکز پر جمع کر سکے۔

انصاف کے ساتھ سوچئے کہ کیا حضرت محمد ﷺ کے علاوہ کوئی اور نمونہ آپ کے سامنے آتا ہے؟“



واصبحاہ..... واصباحاہ..... ہائے صبح کا خطرہ

صفا کی چوٹی سے ایک صبح یہ صدا کہہ کی واوی میں گونج رہی تھی.....

صبح کا وقت عرب میں شب خون، ڈاکہ زنی کے لئے بہترین وقت ہوتا تھا.....

واصبحاہ..... سے ایسے ہی کسی شدید خطرہ کا اعلان ہوتا تھا۔

آج صفا کی پہاڑی پر مکہ کا سب سے سچا انسان ایک بڑے خطرہ سے خبردار کر رہا تھا اس نے کہا لوگو! اگر میں تمہیں بتاؤں کہ پہاڑ کی دوسری طرف ایک بڑا لشکر تم پر حملہ آور ہونے والا ہے تو کیا تم سچ مانو گے؟

اَرَأَيْتُمْ اِنْ حَدَّثْتُكُمْ اَنَّ الْعَدُوَّ
مُصِيبُكُمْ اَوْ مُمَسِّكُكُمْ اَكُنْتُمْ
تُصَدِّقُونَنِي قَالُوا: نَعَمْ قَالَ: فَاِنِّي
نَذِيرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ۔

اے لوگو! اگر تمہیں یہ بتاؤں کہ دشمن تم پر
صبح کے وقت یا شام کے وقت حملہ کرنے والا
ہے، تو کیا تم میری اس بات کی تصدیق
کرو گے۔ سب بیک زبان بول اٹھے کیوں
نہیں! تب آپ ﷺ نے فرمایا کہ: تم کو ایک

(بخاری شریف کتاب التفسیر ۲ / ۷۴۳)

سخت عذاب سے ہوشیار کرتا ہوں (یعنی وہ
لشکر اللہ کے عذاب کا لشکر ہے اس سے بچتے
کے لئے تم اللہ کی پناہ میں آ جاؤ)

پہاڑی کا یہ وعظ بنیادی صداقتوں کو اپنے دامن میں سیٹھ ہوئے ہے۔ جبل صفا کی بلندی
سے خطاب، مقام نبوت کی رفعت ہے، جہاں سے صرف اللہ کا رسول حال اور مستقبل کو دیکھتا
ہے..... پہاڑی کے اس پار کیا ہے، لوگوں کو نظر نہیں آ رہا ہے..... وہ غیب پر یقین اور
اللہ کے رسول پر اعتماد کرتے ہیں۔ آپ ﷺ کی دعوت کی بنیاد بلکہ یہ کہنے کے پورے دین کا

خلاصہ اور نچوڑ کلمہ ”لا الہ الا اللہ“ ہے۔ لفظ ”الہ“ دعوت اور اس کے مقصد کو پوری طرح سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ دراصل ایک انقلابی کلمہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب پوری زندگی خواہ اس کا تعلق عبادت سے ہو یا معیشت سے، معاشرت و سیاست سے ہو، یا اخلاق و معاملات سے، اپنی پوری زندگی ایک رب کے حوالے کرنی ہے اور پوری زندگی میں صرف اور صرف اسی کے بنائے ہوئے طریقے اور ضابطے پر چلنا ہے..... ”اللہ ہی“ اور ”اللہ بھی“ کا فرق بالکل واضح ہے..... ”لا“ کے ساتھ ہر چیز کی نفی اور انکار، اور ”الا“ کے ساتھ اللہ کا اثبات..... اس میں صرف اور صرف ”ہی“ سما سکتا ہے..... ”بھی“ کی کوئی گنجائش نہ تھی، نہ ہے۔

”لا الہ الا اللہ“ اس فکری بنیاد کو سنوارتا ہے جہاں سے انسان کا بگاڑ شروع ہوتا ہے۔

انسان کا بگاڑ اس کے ذہن سے شروع ہوتا ہے..... ذہن بگڑا رہے تو کوئی قانون کوئی حکومت اور کوئی ادارہ انسان کو درست نہیں کر سکتا..... فکر و ذہن کی درستی اصلاح کی بنیاد ہے۔ بنیاد درست اور مضبوط ہے تو اس پر مستحکم عمارت بن سکتی ہے۔

ایمان یہ یقین دیتا ہے کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا ایک اللہ ہے۔ وہی کائنات کا مالک، حاکم اور پروردگار ہے۔ کسی پہلو سے اس کا کوئی ساجھی اور شریک نہیں ہے۔ زمین اس کائنات کا ایک حصہ ہے..... اس کو پیدا کرنے والا بھی اللہ ہے۔ اسی کا حکم زمین پر بھی اسی طرح چلتا ہے جس طرح آسمانوں پر..... انسان نے زمین اور اس کے وسائل و ذرائع کو نہ پیدا کیا نہ وہ ان کا حاکم و مالک ہے۔

انسانوں کا پیدا کرنے والا بھی اللہ ہے..... اسی کے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے۔ زمین کی ساری چیزیں جو انسان کے کام آتی ہیں ان سب کا مالک اللہ ہے۔ انسان ہر ضرورت میں اللہ کا محتاج ہے اور اس کی دی ہوئی چیزوں کے استعمال میں انسان اللہ کے سامنے جوابدہ ہے۔

دنیا کی یہ زندگی امتحان اور آزمائش کی زندگی ہے..... اس زندگی کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں اور اللہ کے دیئے ہوئے اختیارات کو اللہ کی ہدایت کے مطابق استعمال کرے اور اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں اپنے پیغمبروں کے ذریعے ہدایت کا جو راستہ انسانوں کو بتایا ہے اس پر چلے..... انسان کی اس زندگی کے بعد اصل زندگی آخرت کی ہے۔ جس میں اس کے

اعمال کے مطابق جزا و سزا ملے گی۔ آخرت کی زندگی پائیدار ہے نہ ختم ہونے والی ہے۔
 فکر و ذہن کی اس درستی سے جس کو ایمان و یقین کہتے ہیں انسان کی پوری زندگی کا محور
 بدل جاتا ہے..... اب اس کا اصل مقصود آخرت بن جاتا ہے نہ کہ اس دنیا کی ناپائیدار
 زندگی..... وہ اس دنیا کو سنوارتا ہے آخرت سنوارنے کے لئے..... اس دنیا کو برتتا ہے مگر
 آخرت کے لئے۔

دعوت اسلامی کی یہ فکری بنیادیں ”توحید و آخرت“ اتنی مستحکم، سائنٹفک اور عقل و
 فطرت کے مطابق ہیں کہ اس یقین پر کردار و عمل کی نہایت مضبوط اور مستحکم عمارت تیار ہوتی
 ہے..... ایمان و یقین اور کروار و عمل کی چٹنگی پر ”بنیاد پرستی“ کی پھبتی کسنا اہل دانش کا کام
 نہیں ہے۔

بندے کا اپنے رب کے ساتھ تعلق محبت اور محبت سے عشق میں ڈھلتا جاتا ہے.....
 رب کے ساتھ اس کا دالہانہ تعلق اس کو دوسری ہر چیز سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اس کا سر انفقار
 بلند ہو جاتا ہے، وہ اپنے پروردگار کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھکتا..... انسانیت کا یہ بلند مقام
 توحید کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا..... شرک انسان کو پستی میں پھینکتا ہے اور توحید انسان کو
 بلند کرتی ہے۔

اس یقین والے انسان کے سامنے ہمیشہ یہ بات رہتی ہے کہ وہ اس بلند و بالا ہستی کے
 سامنے جو ابده ہے جو ہر چیز کو دیکھتا ہے، ہر چیز کو جانتا ہے۔ کوئی چیز اس سے چھپی ہوئی نہیں
 ہے، وہ اپنی مخلوق سے بے پناہ محبت کرتا ہے مگر بغاوت اور سرکشی پر اس کی گرفت سخت بھی
 ہے، ایک اللہ کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین اس کو ہر نافرمانی سے بچاتا ہے۔

اس کو موت کے بعد کی زندگی کی فکر لگی رہتی ہے..... وہ اس ہمیشہ رہنے والی زندگی کی
 قدر و قیمت سمجھنے لگتا ہے۔ دنیا اس کے سامنے حقیر ہو جاتی ہے، وہ دنیا پر آخرت کو قربان
 نہیں کرتا اور آخرت کے لئے ہر چیز، یہاں تک کہ اپنی جان کی، اپنے مال کی، اپنے عیش و
 آرام کی، اپنی اولاد کی، کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتا۔

ہر چیز سے اس کا تعلق اللہ کے لئے ہوتا ہے..... یہ چیز اس کے اندر بے پناہ خلوص پیدا

کرتی ہے..... وہ لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے کیوں کہ اس کا رب اس کو پسند کرتا ہے..... ضرورت مندوں کے کام آتا ہے کیوں کہ اس میں اس کے رب کی رضا ہے۔
ان فکری بنیادوں پر کردار و عمل کی تشکیل کے ساتھ اور انسان کے اخلاق کو سنوارنے والی اخلاقی ہدایتوں کے ساتھ عمل کی ضابطہ بندی کے لئے قانون اور شریعت بھی ہوتی ہے۔
خلاف ورزی پر سزا کا ڈر بھی ہوتا ہے، اور اس طرح زندگی کا ایک مکمل نظام وجود میں آتا ہے جس سے معاشرہ بنتا ہے، سوسائٹی بنتی ہے۔

اخلاقی ہدایات اور قانونی ضابطوں کا ٹھیک ٹھیک امتزاج انسانی زندگی کو تعمیر کی طرف لے جاتا ہے۔ تخریب کے تمام رخنے بند ہوتے ہیں..... جہاں جہاں سے تخریب کا خطرہ ہوتا ہے اس کے روکنے کا بھرپور انتظام کیا جاتا ہے۔ ایک صالح سوسائٹی کی تعمیر اس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو سنوارنے کے لئے ایک طرف اللہ کی کتاب قرآن مجید ہے جس میں انسان کی ہدایت، اس کی رہنمائی اور انسان کی دنیا اور اس کی آخرت دونوں کی فلاح کے لئے پوری پوری رہبری کا سامان ہے..... دوسری طرف قرآن مجید کا چلتا پھرتا پیکر حضرت محمد ﷺ کی سیرت کی صورت میں دنیا کے سامنے ہے۔

اور یہ بات یقینی ہے کہ انسان کانوں سے نہیں آنکھوں سے بنتا ہے..... اگر اس کے سامنے عملی نمونہ نہ ہو کوئی جیتا جاگتا کردار اس کے سامنے نہ ہو تو سارے وعظ و نصیحت خوبصورت الفاظ کا پیکر تو بن جاتے ہیں، مگر اس کے دل کے دروازے پر دستک نہیں دے سکتے..... مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ”خطبات مدراس“ میں ایک جگہ ذکر کیا ہے کہ ہم اوائل فروری ۱۹۲۳ء میں جس جہاز ”کرد کو دیا“ سے حجاز اور مصر سے واپس آرہے تھے۔ اتفاق سے مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور بھی اسی جہاز سے امریکہ کے سفر سے واپس ہو رہے تھے۔ ایک رفیق سفر نے ان سے سوال کیا کہ برہمن سماج کی ناکامی کا سبب کیا ہے، حالانکہ اس کے اصول بہت منصفانہ صلح کل کے تھے، اس کی تعلیم تھی کہ سارے مذہب سچے اور کل مذہبوں کے بانی اچھے اور نیک لوگ تھے، اس میں عقل اور منطق کے خلاف کوئی چیز نہ تھی، وہ موجودہ

تمدن، موجودہ فلسفے اور موجودہ حالات کو دیکھ کر بنایا گیا تھا، تاہم اس نے کامیابی حاصل نہ کی۔ فلسفی شاعر نے جواب میں کہا کہ برہمن سماج اس لئے ناکام ہوا کہ اس کے پیچھے کوئی شخص زندگی اور عملی سیرت نہ تھی جو ہماری توجہ کامرکز بنی اور ہمارے لئے نیکو کاری کا نمونہ ہوتی۔ اور یہی وہ نکتہ ہے کہ دنیا میں ایسا تو ہوا ہے کہ نبی یا رسول آئے اور کوئی مستقل کتاب، اللہ کی طرف سے نازل نہیں ہوئی، مگر یہ نہیں ہوا کہ کتاب اتری ہو اور رسول نہ آیا ہو۔ یعنی رسول تو بغیر کتاب کے ہو سکتا ہے لیکن کتاب بغیر رسول کے نہیں ہو سکتی۔

دین اسلام واحد دین ہے جس کے پاس انتہائی محفوظ اللہ کی کتاب قرآن مجید بھی ہے اور اس کے ساتھ پوری طرح اصل صورت میں صحیح و سالم حضرت محمد ﷺ کی سیرت بھی ہے، کتاب و سنت دین اسلام کا دنیائے انسانیت کے لئے انتہائی بیش قیمت سرمایہ ہے..... انسانیت کو نجات کی منزل پانے کے لئے نبی رحمت ﷺ کا دامن تھامنا ہی ہوگا..... کیوں کہ نبی رحمت ﷺ کی تعلیم دنیا اور آخرت دونوں جہاں کی فلاح و کامیابی کی ضمانت دیتی ہے۔

یہ تعلیم تسلی دیتی ہے کہ ”لا تخافوا“ اس راہ پر قدم رکھتے ہوئے ذرا خوف کی ضرورت نہیں ہے ہر طرح کے خطرات سے محفوظ یہ صراطِ مستقیم ہے یہ سیدھا راستہ ہے جو براہِ راست منزلِ نجات تک پہنچاتا ہے۔

یہ تعلیم انسان کو تسلی دیتی ہے کہ ”لا تحزنوا“ تم غمگین مت ہو۔ اس راہ پر چلنے کے بعد تمہیں کسی غم و حزن کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، تمہیں پچھتانا نہیں پڑے گا، تمہیں شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا کہ ہائے ہم کیوں اس راستے پر چلے، تمہیں کوئی افسوس نہ ہوگا، کوئی حسرت نہ ہوگی۔

تم دنیا میں بھی ایک مطمئن اور پرسکون زندگی گزارو گے جس میں خود غرضی نہ ہوگی لالچ نہ ہوگا، حرص و ہوس نہ ہوگی، بے انصافی نہ ہوگی اور مرنے کے بعد دوسرے جہان میں بھی تم وہاں کی لذتوں سے لطف اٹھاؤ گے اور ابد الابد تک عیش و راحت میں رہو گے۔ تم اس دنیا سے اس حالت میں جاؤ گے کہ تم اپنے رب سے راضی ہو گے اور تمہارا رب تم سے راضی ہوگا..... دونوں جہان کی زندگی کا تمہارا یہ سفر ایسا خوشگوار سفر ہوگا جس کی لذتوں کا احساس

تمہیں شاد کام کر دے گا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے۔

إِنَّ الدِّينَ قَالُوا رَبَّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا
تَنْزِيلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَنْ لَا تَعْفُوا
وَلَا تَحْزَنُوا (حم السجده : ۳۰)

بے شک جنہوں نے کہا ہمارا رب تو اللہ ہے،
پھر اسی پر جے رہے، ان پر فرشتے نازل ہوتے
ہیں کہ تم مت ڈرو اور غم نہ کھاؤ۔

یعنی دل سے اللہ کے رب ہونے کا اقرار و یقین کیا اور اس بات پر پوری طرح قائم رہے، اس کی ربوبیت والوہیت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرایا، نہ اس یقین و اقرار سے مرتے دم تک ہٹے، جو کچھ زبان سے کہا تھا اس کے تقاضوں پر اعتقاد و عمل ہر اعتبار سے ثابت قدم رہے، اللہ کی ربوبیت کاملہ کا حق پہچانا، جو عمل کیا خالص اس کی خوشنودی اور شکر گزاری کے لئے کیا، اپنے رب کے عائد کردہ حقوق و فرائض کو سمجھا اور ادا کیا، غرض ماسوا سے منہ موڑ کر سیدھے اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اسی کے راستے پر چلے ایسے مستقیم الحال بندوں پر موت کے قریب اور قبر میں پہنچ کر اور اس کے بعد قبروں سے اٹھنے کے وقت اللہ کے فرشتے اترتے ہیں اور ان کو تسکین و تسلی دیتے ہیں کہ اب تمہارے لئے ڈرنے اور گھبرانے کا کوئی موقعہ نہیں ہے۔

یہ جھوٹی امیدیں اور خیالی پلاؤ نہیں ہیں بلکہ زندگی کے حقائق ہیں، عقل و فہم کے تقاضے ہیں فطرت کی صدا ہے، روح کی آواز ہے..... اگر انسان بے لاگ ہو کر اپنے اندر جھانکنے کی کوشش کرے تو سازِ فطرت سے اس کو ایک ہی نغمہ سنائی دے گا ”لا الہ الا اللہ“۔

اگر وہ غیر جانبداری کے ساتھ دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھے گا تو اپنی مکمل صورت میں جو شخصیت قابلِ تقلید نمونے کے طور پر نظر آئے گی اور جو پورے طور پر تاریخ کی روشنی میں جیتی جاگتی ہوگی وہ صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت ہوگی۔

ہر طرح سے جانچ پرکھ کر وہ اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ اس شخصیت میں کسی پہلو سے کوئی کمی، کوئی نقص ہے ہی نہیں، وہ انسانیت کا ایسا کامل نمونہ ہے کہ آج تک اس جیسا دوسرا نمونہ زمانے کی آنکھوں نے نہیں دیکھا۔ حضرت محمد ﷺ کی بے داغ شخصیت اس کو عبادت گاہوں سے لے کر گھر تک، گھر سے لیکر بازار تک، بازار سے لے کر ایوانِ سیاست تک اور

ایوان سیاست سے لے کر بین الاقوامی تعلقات تک بہترین مثال نظر آئے گی۔

آج دنیا بڑی تیزی کے ساتھ ایک عالمی نظام کی طرف بڑھتی چلی جا رہے۔ وہ عالمی نظام کیا ہو، اس کے خدو خال کیسے ہوں، تاریخ میں ہے کوئی ایسا نمونہ جو اس عالمی نظام کے لئے مثال کا کام دے سکے، جو پوری دنیا کے انسانوں کو ایک کنبہ کی صورت میں جوڑ سکے، جو دنیا کی تمام قوموں کو انصاف دلا سکے، جو ہر طرح کے بھید بھاؤ کو مٹا کر پوری دنیا کے انسانوں کو ایک مرکز پر جمع کر سکے۔

انصاف کے ساتھ سوچئے کہ کیا حضرت محمد ﷺ کے علاوہ کوئی اور نمونہ آپ کے سامنے آتا ہے؟

اور بات صرف نظریات کی ہی نہیں ہے، دلکش اور خوبصورت افکار کی ہی نہیں ہے، بلکہ بات عمل کی ہے..... حضرت محمد ﷺ نے عمل کی دنیا میں ایک انصاف پرور، صالح اور پاکیزہ معاشرہ ”لا الہ“ کی بنیاد پر قائم کر کے دکھایا..... اس سے بہتر معاشرہ، اس سے زیادہ مرتب نظام حکومت، اس سے بڑھ کر عادلانہ آئین، دنیا کی پوری تاریخ میں کوئی دوسرا نہیں پایا جاتا۔ اگر دنیا کے تمام اہل فکر و دانش سر جوڑ کر بیٹھیں اور پوری دنیا کے لئے ایک نظام نو کے خدو خال بنانے کی کوشش کریں اور پھر تجربے کے بعد معلوم ہو کہ جو کچھ ہم نے بنایا تھا وہ صرف ریت کا ایک گھر وندہ تھا ایک خیالی تعمیر تھی..... جو عمل کی دنیا میں تجربے کے بعد ناکام ثابت ہوئی جیسا کہ بہت سے ازم اپنی ناکامی کے خود گواہ ہیں..... تو کیا اس ناکامی کا سامنا کرنا زیادہ بہتر ہوگا، یا ایک بنے بنائے، کامیاب تجربہ سے گزرے ہوئے ایسے نظام کو اپنا لینا دانشمندی ہوگی کہ جس کو ہر طرح ٹھوک بجا کر دیکھا اور پرکھا جا چکا ہے اور زمانے نے اس کی کامیابی کی گواہی دی ہے۔ کیا آپ نے کبھی ایسا امن و امان دیکھا ہے کہ ایک تنہا عورت مال و دولت کے ساتھ اس کنارے سے اس کنارے تک بے خوف و خطر سفر کرتی ہے اور کوئی اس کی طرف ترچھی نگاہ سے دیکھنے والا بھی نہیں ہے۔

کیا آپ نے کبھی ایسا عادل و انصاف دیکھا ہے کہ قاضی وقت بھری عدالت میں خلیفہ المسلمین کے خلاف فیصلہ سنائے، وہ عام آدمیوں کی طرح عدالت میں حاضر ہو اور سر جھکا کر

اس فیصلے کو قبول کرے۔

کبھی آپ نے رائے کی آزادی اور جمہوریت کا یہ انداز بھی دیکھا ہے کہ ایک ضعیف بوڑھی عورت بھرے مجمع میں حاکم وقت کو چیلنج کرے کہ یہ بتاؤ کہ تم نے سب کو ایک ایک چادر دی تمہارے پاس دو کہاں سے آئیں اور حاکم وقت کی پیشانی پر کوئی شکن نہ آئے۔

کیا آپ کو کھلے پن کا یہ نمونہ کہیں نظر آتا ہے کہ خلیفہ وقت ماتحت افسر کو لکھتا ہے کہ میری اگلی تنخواہ پیشگی دیدو اور ماتحت افسر جواب دیتا ہے کہ امیر المومنین خادم تعمیل حکم کے لئے حاضر ہے، مگر امیر المومنین کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ وہ اگلے مہینے تک زندہ بھی رہیں گے اور امیر المومنین یہ پڑھ کر زار و قطار روتا ہے کہ آج افسر خزانہ نے مجھے بچا لیا ورنہ میں تو تباہ ہو جاتا۔

آج دنیا جن مسائل اور حالات سے دوچار ہے اور جو خطرات اس کے سر پر منڈلا رہے ہیں، اس کا بے لاگ تجزیہ کر کے جب بھی انسان اس کا حل تلاش کرے گا تو اس کے سامنے صرف ایک ہی راہ ہوگی ایک ہی حل ہوگا اور وہ راہ حضرت محمد ﷺ کی ہوگی۔

زمانہ ہو گیا، گذر اٹھا کوئی بزمِ انجم سے غبارِ راہ روشن ہے بہ شکلِ کہکشاں اب تک یہ کوئی شاعری نہیں واقعہ یہ راہ آج بھی روشن ہے..... آج بھی یہ راستہ صاف اور اتنا ہی بے غبار ہے جتنا چودہ سو سال پہلے تھا..... یہ کوئی تاریخ کی گرد میں چھپی ہوئی شخصیت نہیں ہے..... یہ اللہ کے رسول ہیں جن کی نبوت قیامت تک کے لئے ہے..... حضرت محمد رسول ﷺ کی قیادت اور رہنمائی آج بھی توانا، آج بھی شاداب ہے..... ان کی رہنمائی ماضی سے لے کر مستقبل تک ہے، جس کے بعد کسی اور طرف دنیائے انسانیت کو دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے..... انسانیت کی نجات حضرت محمد ﷺ کی پیروی میں ہے ان کے بغیر انسانیت نجات کی منزل نہیں پاسکتی۔

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست اگر باو نہ رسیدی تمام بولہسی است
بات مغرب پر مشرق کے یا مشرق پر مغرب کے غلبہ کی نہیں ہے..... بات کسی قوم کے کسی قوم پر تسلط کی بھی نہیں ہے..... بات اس کی ہے کہ ایک ایسا عادلانہ نظام دنیائے

انسانیت پر بالادست رہے جو انسانوں کو انسانوں کی ہر طرح کی مادی اور جسمانی غلامی سے نکال کر صرف اور صرف ایک رب کا بندہ اور غلام بنادے ایک رب کی غلامی انسانی آزادی کا دوسرا نام ہے ۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات جو تمام انسانوں کو مساوات و برابری سے ہمکنار کر کے طاقتور کو کمزور کا محافظ اور نگہبان بنادے اسی میں عالم انسانیت کی نجات ہے۔

عقل و فہم کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں کہ عقل و فہم ہی وہ قوت ہے جو انسان کو دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے یہ قوت ذریعہ ہے معلوم سے غیر معلوم کو حاصل کرنے کا۔

مگر انسان میں عقل کے علاوہ قلب و ضمیر نام کی ایک چیز بھی ہے اس کا فیصلہ بڑا صحیح اور چھٹا ہوتا ہے انسان کے وجود میں فیصلہ کن دراصل قلب و ضمیر ہی ہے اگر دل نہ مانے تو عقل بھی محو تماشا ئے لب بام رہ جاتی ہے قلب و ضمیر کے فتوے کا عالم یہ ہے کہ اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ سے جب ایک شخص نے گناہ کی تعریف پوچھی کہ گناہ کیا ہے تو آپ ﷺ نے جواب دیا ”استفت قلبك“ (مسند احمد ۴/۲۲۸) اپنے دل سے فتویٰ لے لو، اس کی کھٹک بتا دے گی کہ گناہ کیا ہے قلب صافی و سلیم ہمیشہ صحیح جواب دیتا ہے، وہ انسانی فطرت کا سب سے بڑا ہم راز ہے اس کا فیصلہ فطرت کے عین مطابق ہوتا ہے۔

آئیے کیوں نہ ہم ضمیر کو تھوڑی دیر کے لئے آزاد چھوڑ کر اس سے فطرت کی صدا سنیں۔

اس دل کو ذرا رب سے جوڑیے اور پھر دیکھئے دنیا اور آخرت کا لطف کیا ہوتا ہے، زندگی کیسی بامعنی اور بامقصد ہوتی ہے۔ دنیا کا بھی ٹھیک ٹھیک اور پورا پورا مزہ ادبنداروں اور اپنے رب سے لولگانے والوں کو ہی آتا ہے ان اہل دل کا احساس و ذوق اتنا لطیف ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ کی ہر نعمت کی لذت کو پورا پورا محسوس کرتا ہے قلب صافی سے جب کثافت ہٹتی ہے

اور وہ آئینہ کی طرح صاف و شفاف ہو جاتا ہے تو اس میں ہر چیز کا پورا عکس پڑتا ہے..... جیسے کسی کا ہم دم ساتھ ہو تو ہر چیز کا اس کو مزہ آتا ہے، جنگل میں بھی متکل نظر آتا ہے اور یار کے بغیر ہر چیز بے مزہ، بے روح اور بے لطف معلوم ہوتی ہے۔

جب دنیاوی ہم دم و محبوب کا یہ معاملہ ہوتا ہے تو محبوب حقیقی کی تو بات ہی اور ہے، اس محبوب حقیقی کا قرب ہر چیز کی لذت کو دو آتشہ کر دیتا ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ (۱) دارالعلوم دیوبند کے سرپرست تھے..... علم و عرفان کی دولت سے مالا مال..... میرے جد امجد مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی (۲) کے برادر خورد مولانا حبیب الرحمن عثمانی (۳) (مہتمم خاس دارالعلوم دیوبند) کا تربیتی تعلق ان سے قائم ہوا، تو ان کو ذمہ داری یہ سونپی گئی کہ تہجد کے وقت مولانا گنگوہیؒ کے لئے چائے بنا کر دیں..... مولانا حبیب الرحمن خود انتہائی باذوق مگر مربی ان سے زیادہ باذوق۔

پہلے دن چائے بنا کر لے گئے، پیش کی اور بعد میں دریافت کیا، حضرت چائے ٹھیک تھی؟ فرمایا کچھ کسر تھی..... کیا کسر تھی یہ نہیں بتایا۔

دوسرے دن اور زیادہ اہتمام سے بنائی..... پھر بھی جواب تھا کچھ کسر تھی۔

تیسرے دن گرم پانی سے پیالی دھونے کے بعد اس کو صاف کپڑے سے خشک بھی کیا۔

فرمایا آج ٹھیک تھی..... آج کچے پانی کا اثر نہ تھا۔

اللہ اکبر ذوق و احساس کا یہ عالم کہ پیالی میں پانی کا ہلکا سا اثر بھی اس احساس سے چھپ نہ

سکا۔

میں عرض کرتا ہوں کہ ذوق و احساس کی یہ شفافیت..... فطری ذوق کے علاوہ کیا اسی معرفت و عرفان سے نہیں ہے جو قلب کو ششے کی طرح صاف اور روح کو پھول کی طرح ہلکا پھلکا کر دیتی ہے.....

(۱) مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ابن مولانا ہدایت احمد ولادت ۱۲۴۲ھ وفات ۱۳۲۳ھ، م ۱۹۰۵ء۔

(۲) مفتی عزیز الرحمن عثمانی ابن مولانا فضل الرحمن عثمانی ولادت ۱۲۷۵ھ وفات ۱۳۴۷ھ م ۱۹۲۸ء۔

(۳) مولانا حبیب الرحمن ابن مولانا فضل الرحمن وفات ۱۳۳۸ھ م ۱۹۲۹ء۔ آپ ۱۳۲۳ھ تا ۱۳۴۷ھ۔

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم رہے۔

دنیا میں بھی اللہ کی نعمتوں کا صحیح لطف اہل دل ہی لیتے ہیں۔

اسلام کو ایک ازم کے انداز میں دیکھنے کے بجائے اس کو ایک انسانی تربیتی نظام کے رخ سے دیکھئے..... کہ وہ کس طرح اللہ اور بندوں کے حقوق و فرائض کی ادائیگی کا اہتمام کرتے ہوئے اس میں اعتدال و توازن قائم رکھتا ہے۔

انسان اپنی فطری ساخت کے اعتبار سے ہیرا ہے..... ”لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ“ (التین: ۴۔ کہ ہم نے انسان کو بہترین انداز کے ساتھ پیدا کیا ہے)۔ تو اسلام اس ہیرے کو تراش خراش کر کے چمکانے والا ہے..... وہ ایک تربیتی اخلاقی نظام ہے، جس کا ایک حصہ نظم مملکت اور تدبیر منزل بھی ہے۔

”عرفان محبت عام نہیں“ مگر اس مے کدہ عرفان و محبت کے چند گھونٹ جس کو مل گئے وہ صبح ابد تک مستی میں رہے گا ایسا سرور و سرمستی جو انسان کو خودی، خود شناسی اور بے نیازی کی دولت عطا کرتا ہے۔ ع

ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے۔

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت پاک کا ایک بڑا دلکش پہلو یہ بھی ہے جس طرف نگاہیں کم متوجہ ہوتی ہیں..... وہ یہ کہ آپ ﷺ ہر عمل کو نہایت خوبی سے انجام دیتے تھے..... ”حسن کل شئی“ ہر کام نہایت عمدگی سے کرنا، کام چھوٹا ہو یا بڑا..... گھر کا ہو یا باہر کا معیشت کا ہو یا سیاست کا..... تجارت کا ہو یا معاشرت کا..... ”حسن کل شئی“ ہر چیز میں حسن و جمال..... آپ ﷺ کی سیرت کا جمالیاتی پہلو، آپ ﷺ کی سادہ زندگی اور سادہ لباس اور سادہ رہن سہن، یہاں تک کہ گفتگو کی دل نوازی میں بھی انتہائی نمایاں تھا..... اور حدیث کے الفاظ بھی تازہ کر لیجئے ”إِنَّ اللَّهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ“ (مسلم شریف، کتاب الایمان ۶۵/۱) اللہ تعالیٰ خود جمیل ہیں جمال کو پسند کرتے ہیں..... یہ پہلو عبادت میں ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر گوشہ میں آپ کو نظر آئے گا..... عاتکہ بنت خالد ام مہجد..... اپنے شوہر ابو مہجد کے سامنے گل فشانی کرتے ہوئے کہتی ہیں

”ابو مہجد کیا کہوں میں نے ایک شخص کو دیکھا جس کی نظافت نمایاں، چہرہ تاباں، پاکیزہ رو،

پسندیدہ خو، نہ فربہی کا عیب، نہ لاغری کا نقص، چہرہ وجیہ، جسم تنومند، موزوں قامت، سر گلیں آنکھیں، سیاہ پتلیاں، شفاف جسم..... جن پر گھنی پلکیں سایہ فگن، ہلالی ابرو باریک اور پیوستہ، گردن لمبی صراحی دار، گنجان داڑھی، سر کے بال سیاہ گھنگھریالے، اور پھر کہتی ہیں.....

آواز میں دلکش کھک، شیریں لطافت، کلام شیریں، الفاظ واضح، نہ کم سخن، نہ بسیار گو، جملوں میں الفاظ جیسے موتی پروئے ہوئے..... اور آخری جملہ.....

”تروتازہ شاخ کی طرح خوش نظر“

جمالِ یاقی پہلو انسانی فطرت کے لئے مرغوب و محبوب ہے..... زندگی میں حسن و جمال اور نکھار لاتا ہے، انسان کو یہ اعلیٰ نمونہ سیرت نبوی میں ملے گا، انسانی زندگی کو جمال و کمال سے ہم کنار کرنے کے لئے منبع جمال و کمال اور اس کے مظہر اتم کی طرف آنا ہو گا۔

غرض عالم انسانیت کی فلاح و صلاح نبی رحمت ﷺ کے دامن رحمت کے تھانے میں ہے..... اس دامن کی وسعتیں سارے عالم کے لئے ہیں..... کالوں کے لئے بھی، گوروں کے لئے بھی، مشرق کے لئے بھی مغرب کے لئے بھی۔

اگر ہم ایسا سماج چاہتے ہیں، جس میں

○ دجل و فریب کی جگہ..... صدق و صفا -

○ بد عہدی و خیانت کی جگہ..... پاس عہد و امانت -

○ ہو ا پرستی کی جگہ..... حق پرستی -

○ ظن و تخمین کی جگہ..... ایمان و یقین ہو۔

اور اگر ہم ایسا معاشرہ بنانا چاہتے ہیں، جس میں

○ اخلاقی انتشار و ہوس رانی کی جگہ..... ضبط نفس و پاکیزگی کا دور دورہ ہو۔

اور اگر ہم ایسا نظام چاہتے ہیں..... جہاں

○ اقتصادی چہرہ دستیوں کی جگہ..... معاشی توازن ہو،

○ جہاں زیر دست، بالادستوں کے ظلم و ستم اور ان کے خوف سے مامون ہوں،

- جہاں مخلوق کی گردنیں مخلوق کی غلامی سے آزاد ہوں ،
- جہاں نیکی کی قوتوں کو ابھرنے، پینے اور فروغ پانے کے لئے سازگار فضا میسر آ سکے،
- جہاں بدی کے چشمے بے آب ہو کر خشک ہو جائیں۔
- جہاں ہر انسان بلا لحاظ مذہب و ملت اور بلا تفریق نسل و رنگ یہ محسوس کرے کہ امن و آشتی، عدل و انصاف، آزادی، ضمیر، احترام انسانیت، تحفظ جان و مال اور بقائے نیک و ناموس اسی نظام میں ہے تو!
- انسانیت کے لئے واحد راہ نجات وہی ہے جو نبی رحمت ﷺ نے اپنے قول اور اپنے عمل سے پیش کی ہے۔

انسانیت کے محسن اعظم ﷺ اسی کے لئے راتوں کو روتے رہے اور دن میں دکھ جھیلے رہے، پتھر کھاتے رہے کہ بھنگی ہوئی انسانیت اس صراطِ مستقیم اور شاہِ راہِ اعظم پر آجائے۔

اسلام ایک صالح نظامِ زندگی کی پوری اسکیم کا نام ہے اس کے لئے حقوق و فرائض کا ایک مکمل نظام ہے جس کا ہر حصہ دوسرے حصے کے ساتھ بدن کے اعضاء کی طرح جڑا ہوا ہے اور اس کا ایک مجموعی مزاج ہے جو تقسیم ہو کر قائم نہیں رہ سکتا اس نظامِ زندگی میں زندگی الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں ہے۔ یہ ایک خاص طریقِ فکر (Attitude of mind) اور زندگی کا ایک خاص نقطہ نظر (Outlook of life) ہے یہ طریقہ فکر اور نقطہ نظر مرکزی محور ہے جس پر انسان کی ہر حرکت اور ساری جدوجہد گردش کرتی ہے۔ یہ طریقِ فکر فیصلہ کرتا ہے کہ انسان پر اپنے پروردگار کے کیا حقوق ہیں اس کے اپنے نفس کے، ماں باپ کے، بیوی بچوں کے، قربت داروں، پڑوسیوں، معاملہ داروں، ہم مذہبوں اور غیر مذہب والوں کے کیا حقوق ہیں۔ دشمنوں، دوستوں، ساری نوعِ انسانی حتیٰ کہ کائنات کی ہر شے کے کیا حقوق ہیں۔ یہ ان تمام حقوق کا تعین بھی کرتا ہے اور ان کے درمیان کامل توازن اور عدل بھی قائم کرتا ہے۔ پھر یہی طریقہ فکر اور نظریہ حیات انسان کے لئے زندگی کا ایک بلند اخلاقی نصب العین اور ایک پاکیزہ روحانی معنائے نظر متعین کرتا ہے اور زندگی کی تمام سعی و جدوجہد کو خواہ وہ کسی میدان میں ہو، ایسے راستوں پر ڈالنا چاہتا ہے جو ہر طرف سے اسی مرکز

تک پہنچتی ہوں۔

یہ مرکز ایک فیصلہ کن چیز ہے..... جو شے اس مرکزی مقصد تک پہنچنے میں مددگار ہوتی ہے اسے اختیار کر لیا جاتا ہے اور جو شے سدِ راہ ہوتی ہے اسے رد کر دیا جاتا ہے..... فرد کی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر جماعت کی زندگی کے بڑے سے بڑے معاملات تک یہ معیار یکساں کار فرما ہے۔

وہ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ ایک شخص کو کھانے پینے میں، لباس میں، صنفی تعلقات میں، لین دین میں، غرض زندگی کے ہر معاملہ میں ان حدود کو ملحوظ رکھنا چاہئے تاکہ وہ ”مرکز مقصود“ کی طرف جانے والی ”سیدھی راہ“ پر قائم رہے اور ٹیڑھے راستے پر نہ پڑ جائے۔

وہ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں افراد کے باہمی روابط کن اصولوں پر مرتب کئے جائیں جن سے معاشرت، معیشت، سیاست غرض ہر شعبہ زندگی کی ترقی ایسے راستوں پر ہو جو اصل منزل مقصود کی طرف جانے والے ہوں، اور ان راہوں سے بچیں جو اس سے دور ہٹانے والی ہوں۔

یہ نقطہ نظر اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ زمین و آسمان کی جن قوتوں پر انسان کو دسترس حاصل ہو اور جو چیزیں اس کے لئے مسخر کی جائیں، ان کو وہ کن طریقوں سے استعمال کرے، تاکہ وہ اس کے مقصد کی خادم بن جائیں اور کن طریقوں سے پرہیز کرے تاکہ وہ اس کی کامیابی میں رکاوٹ نہ بنیں۔

غرض وہی ایک نقطہ نظر اور طریق فکر ہے اور وہی ایک طرزِ عمل ہے جو مسجد سے لے کر بازار اور میدانِ جنگ تک عبادت کے طریقوں سے لے کر چیزوں کے استعمال تک وضو اور طہارت کے جزوی مسائل سے لے کر اجتماعیات، معاشیات، سیاسیات اور بین الاقوامی تعلقات کے بڑے بڑے مسائل تک، مکتب کی ابتدائی تعلیم سے لے کر آثارِ فطرت کے انتہائی مشاہدات اور سائنس کی بلند ترین تحقیقات تک زندگی کی ہر حرکت اور فکر و عمل کے تمام شعبوں کو ایک ایسی ”وحدت“ میں پروتا ہے جس کے تمام اجزاء میں ایک مقصدی ترتیب ہے اور ان سب کو ایک مشین کے پرزوں کی طرح اس طور پر جوڑتا ہے کہ ان کی حرکت سے

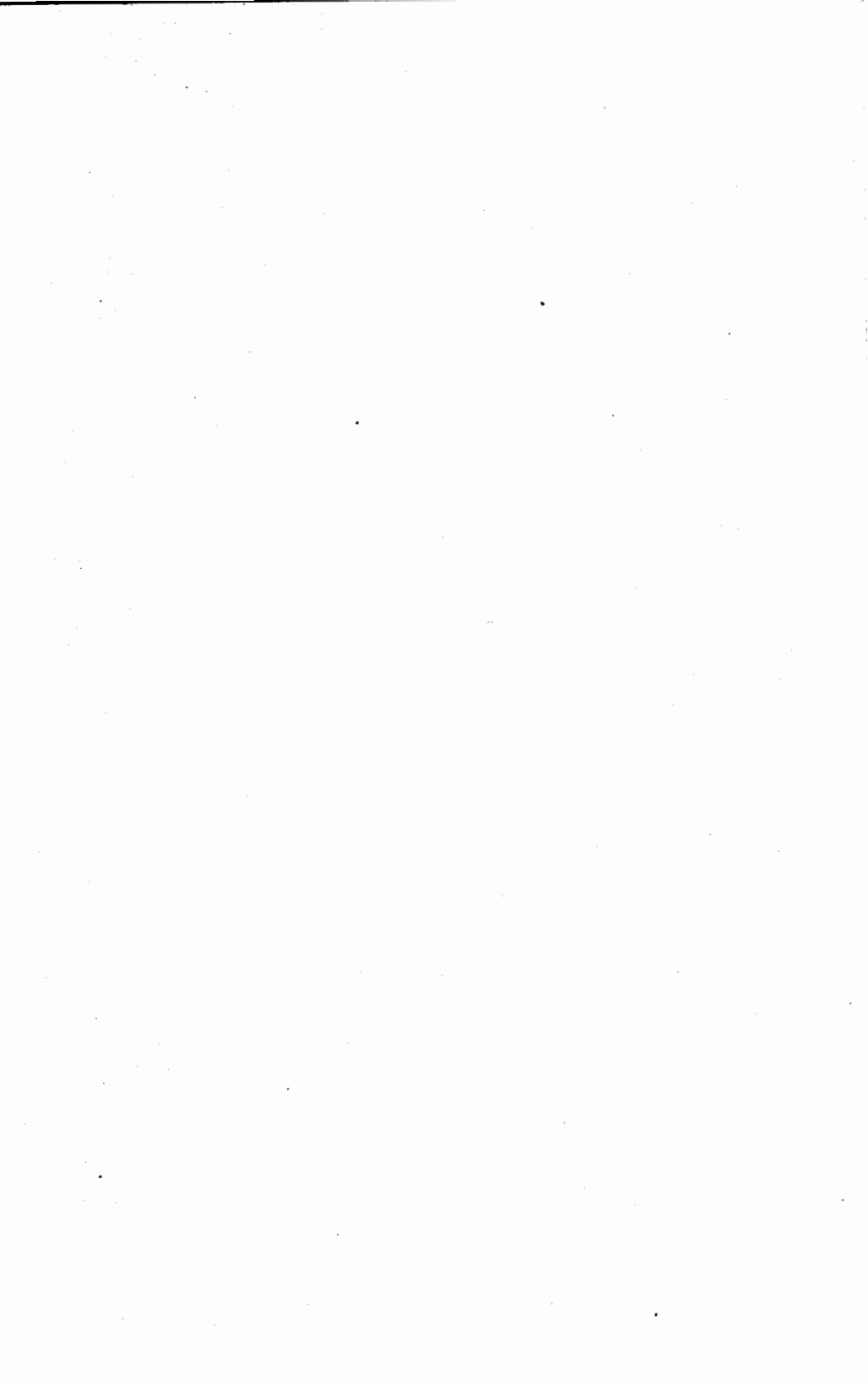
ایک ہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔

طریق فکر دین و دنیا، مذہب اور سیاست کو یکجا کر کے ان کے مجموعہ پر کتاب و سنت کی بالادستی قائم کرتا ہے تاکہ اس کے نتیجے میں عدل اجتماعی (Social Justice) کا وہ نظام قائم ہو جائے جو انسانی حریت، اخوت، مساوات کے متوازن مجموعے کی حیثیت سے اس کے خالق و پروردگار کی رحمت و ربوبیت کا جامع اور کامل مظہر بن جائے۔

یہی وہ طریق نجات ہے جو انسانیت کے سب سے بڑے محسن نبی رحمت حضرت محمد ﷺ نے قائم کر کے دکھایا..... اور آج بھی منزل نجات پانے کے لئے انسان کو اسی کی ضرورت ہے۔

بے شمار درد و سلام اس نبی رحمت ﷺ پر جس کی زبان حق پر رات کی تنہائی میں بھی یہ کلمات ہوتے تھے ”خدا یا میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سب بندے بھائی بھائی ہیں۔“



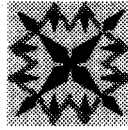


تیسرا خطبہ



نبی رحمت ﷺ کی تعلیم و تربیت
میں توازن اور حسن اعتدال۔

”جس طرح بڑی دنیا اس کائنات میں ایک نظام اور اس نظام میں توازن و اعتدال (Balance) ہے، اور جس طرح چھوٹی دنیا یعنی انسان میں ایک نظام اور ایک بیلنس ہے اور اسی نظام اور نظام میں بیلنس ہونے کی وجہ سے ہر چیز اپنی اپنی جگہ ٹھیک ٹھیک کام کر رہی ہے، بالکل اسی طرح اللہ کے بتائے ہوئے اور اپنے نبیوں کے ذریعے بتائے ہوئے اس دین یعنی دین اسلام میں ایک مکمل نظم اور بہترین بیلنس ہے۔“



اللہ تعالیٰ کی اس کائنات میں جہاں جہاں نظر دوڑائیے حیرت انگیز توازن اور بہترین تناسب اور لاجواب اعتدال نظر آتا ہے..... ہر چیز اپنی اپنی جگہ موزوں اور مکمل نکائی..... یہ زمین جس پر ہم اور آپ رہتے ہیں اس عظیم کائنات کی وسعت کے مقابلے میں ایسی ہے جیسے ایک بہت بڑے ہال یا کمرے میں چھوٹی سی گیند اچھال دی جائے۔

یہ زمین اگر اپنی موجودہ موٹائی اور لمبائی چوڑائی سے مقابلے میں ذرا بھی کم یا زیادہ ہو جاتی تو اس پر زندگی ممکن نہ ہوتی۔ اگر یہ چاند کے برابر ہوتی تو اس کی قوت کشش کم ہو جاتی اور یہ اپنے اوپر پانی اور ہوا کو روک نہ پاتی..... یہ حیرت انگیز بیلنس اور توازن ہے کہ جتنی ہونی چاہئے اتنی ہی ہے، نہ کم نہ زیادہ۔ (۱)

یہ زمین جتنی اب ہے اس سے دو گنی بڑی ہوتی تو اس کی قوت کشش دو گنی ہو جاتی اور ہوا جو اس وقت زمین سے پانچ سو میل کی بلندی پر ہے وہ کھینچ کر بہت نیچے آ جاتی..... یہ زمین فضا میں لٹکی ہوئی ایک گیند کی طرح ہے اور یہ ایک جگہ رکی ہوئی نہیں ہے بلکہ ایک ہزار میل فی گھنٹہ کے حساب سے مسلسل گھوم رہی ہے اور اس طرح چوبیس گھنٹے میں ایک چکر پورا کر لیتی ہے..... اگر زمین کی رفتار ایک ہزار میل فی گھنٹہ کے بجائے دو سو میل فی گھنٹہ ہو جائے تو ہمارے دن اور ہماری راتیں دس گنا بڑھ جائیں گی..... سورج کی گرمی ساری ہریالی کو جلا دیگی اور راتوں کی ٹھنڈک سے سارے درخت اور سبزیاں پالے میں ختم ہو جائیں گی..... یہ حیرت انگیز توازن ہماری زندگی کو قائم رکھے ہوئے ہے۔

(۱) ”وخلق کل شیء بقدرہ تقدیراً“ الفرقان ۲، اور اس نے ہر چیز کو پورا کیا پھر سب کا الگ الگ اندازہ رکھا۔
صنع اللہ الذی اتقن کل شیء
(النمل : ۸۸)
یہ کاریگری اللہ ہی کی ہے، جس نے ہر چیز کو مضبوط بنا رکھا ہے۔

کیسی شان والا ہے اللہ تمام صناعتوں سے بڑھ کر۔
فبارک اللہ احسن الخالقین (المؤمنون : ۶۴)

زمین سے سورج کا فاصلہ تقریباً نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے، سورج کی گرمی بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ ہے..... اگر زمین سے سورج کا فاصلہ کم یا زیادہ ہو جائے تو زمین کا نام و نشان مٹ جائے..... یہ تناسب و توازن حیرت انگیز طور پر قائم ہے۔

زمین ۳۳ درجے کا زاویہ بناتی ہوئی فضا میں جھکی ہوئی ہے..... اس جھکاؤ کی وجہ سے موسم و وقت پر آتے ہیں جاتے ہیں۔ زمین کا زیادہ تر حصہ آبادی کے قابل ہے اور پیداوار ہوتی ہے۔ اگر زمین میں یہ جھکاؤ نہ ہو تو قطبین پر ہمیشہ اندھیرا چھایا رہے۔ سمندر کے بخارات شمال اور جنوب کی طرف چلے جائیں اور زمین یا تو برف کا ڈھیر بن جائے یا بالکل بخر اور صحرا کی طرح ہو جائے۔ زمین کے جھکاؤ میں یہ تناسب انتہائی اہم ہے۔

زمین کے اوپر جو فضا ہے وہ چھ گیسوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں ۷۸ فیصد نائٹروجن، ۲۱ فیصد آکسیجن اور باقی گیسیں تھوڑی تھوڑی مقدار میں ہیں..... اگر گیسوں کا یہ تناسب بدل جائے تو سانس لینا مشکل ہو جائے۔

کائنات کے نظام میں یہ توازن نظام فطرت (Ecological Balance) پورے نظام کو سنبھالے ہوئے ہے۔

○ اس عظیم کائنات یعنی آفاق میں ایک چھوٹی سی کائنات انفس یعنی انسان ہے..... اس چھوٹی سی کائنات میں بھی ایک تناسب اور اعتدال پایا جاتا ہے۔ انسان کے اندر کی کائنات میں حیرت انگیز مواصلاتی نظام موجود ہے۔ جس کو عصبی نظام یا نروس سسٹم کہتے ہیں۔ اس سسٹم کا سینٹر انسان کا بھیجا ہے۔ انسانی بھیجے میں ایک ہزار ملین عصبی خانے ہیں۔ ہر خانے سے بہت باریک تار نکل کر پورے بدن میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ باریک باریک ریشے یا تار ستر ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پیغام بھیجتے اور وصول کرتے ہیں۔ زبان میں تین ہزار ذائقے خانے Taste Buds ہیں۔ جن میں سے ہر ایک باریک ریشے کے ذریعے دماغ سے جڑا ہوا ہے۔ انہی کے ذریعے وہ ہر طرح کے ذائقوں کو محسوس کرتا ہے۔

کان میں ایک لاکھ سننے والے خانے ہوتے ہیں۔ ہر آنکھ میں ایک سو تیس ملین Light Receptors ہوتے ہیں جو کچھ ہم دیکھتے ہیں اس کی تصویر دماغ کو بھیجتے ہیں۔ اس طرح

کائنات کی ہر چیز میں ایک نظام اور نظام میں ایک بیلنس قائم ہے۔

○ جس طرح بڑی دنیا یعنی اس کائنات میں ایک نظام اور اس نظام میں توازن اور اعتدال (Balance) ہے اور جس طرح چھوٹی دنیا یعنی انسان میں ایک نظام اور ایک بیلنس ہے اور اسی نظام اور نظام میں بیلنس ہونے کی وجہ سے ہر چیز اپنی اپنی جگہ ٹھیک ٹھیک کام کر رہی ہے بالکل اسی طرح اللہ کے بنائے ہوئے اور اپنے نبیوں کے ذریعے بتائے ہوئے اس دین یعنی دین اسلام میں ایک مکمل نظم اور بہترین بیلنس ہے۔

انسان کے وجود پر غور کریں تو ایک تو وہ ظاہری وجود رکھتا ہے، یعنی اس کا بدن جو مادی ہے، مٹی، پانی، ہوا اور آگ مختلف چیزوں سے مل کر بنا ہے۔ یہ اس کا ظاہری اور جسمانی وجود ہے جسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

دوسرے اس کا ایک باطنی وجود ہے، جو اس ظاہری وجود کے اندر ایک مستقل شخصیت یا ایک ذات پائی جاتی ہے، یہ باطنی وجود ہمیں اپنی آنکھوں سے نظر نہیں آتا مگر ہمارا وجدان اس کی شہادت دیتا ہے..... قرآن مجید میں اس باطنی وجود کے لئے نفس کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

اس مادی یا ظاہری وجود اور باطنی یا نفسی وجود کے درمیان اسلام توازن (Balance) قائم رکھتا ہے۔

مثلاً جسمانی وجود کا تقاضا ہے کہ اس کو ہوا، پانی، غذا، درجہ حرارت، روشنی اور ایک مناسب ماحول، آرام، راحت، یہ انسان کے جسمانی تقاضے ہیں..... یہ تقاضے اگر پورے نہ ہوں تو اس کا جسمانی وجود باقی رہنا ممکن نہیں ہے، لیکن اگر یہی جسمانی تقاضے مقررہ حدوں سے آگے بڑھ جائیں تو انسان کے لئے تباہی کا سامان بن جاتے ہیں۔

دوسری طرف انسان کا باطنی یا نفسی وجود ہے..... وہ جسمانی وجود کی بہ نسبت زیادہ لطیف ہے۔ اس نفسی وجود کے کئی پہلو ہیں۔ اس کا ایک پہلو روحانی وجود ہے اور یہی زیادہ غالب اور بنیادی پہلو ہے۔

دوسرا پہلو انسان کا اخلاقی وجود ہے جس کو ہم ضمیر کہتے ہیں..... یہی نفسِ لواۓمہ ہے جو غلط روش پر غلط محسوس کرتا ہے..... قرآن مجید میں ہے ”وَلَا أَفْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ“

(القیامۃ : ۲۔ اور قسم کھاتا ہوں نفس ملامت گر کی) یہ انسان کے نفسی وجود کا بڑا اہم پہلو ہے جو اچھائی برائی میں تمیز کرتا ہے۔ اچھائی کو برائی سے ممتاز کرتا ہے..... یہ انسان کا اخلاقی وجود اس کو غلط راستے پر چلنے سے روکتا ہے..... غلط روش پر اس کو ٹوکتا ہے..... ضمیر کی یہ کھٹک انسان کے باطنی وجود کا بڑا اہم پہلو ہے۔

باطنی یا نفسی وجود کا تیسرا پہلو ذہنی پہلو ہے.....

نفسی یا باطنی وجود کے یہ تینوں پہلو یعنی روحانی، اخلاقی اور ذہنی اپنے اپنے تقاضے رکھتے ہیں..... مثلاً انسان کے نفسی وجود کا روحانی پہلو تقاضا کرتا ہے کہ اپنے رب کی عبادت کی جائے اور اس کو یاد کیا جائے..... یہ نفسی وجود کے روحانی پہلو کا بڑا اہم تقاضا ہے..... قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ”وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون“ (الذاریات : ۵۶۔ میں نے اپنی مخلوق سے انسانوں اور جنوں کو اپنی عبادت کے لئے ہی پیدا کیا ہے) انسانوں کا مقصد تخلیق عبادت الہی کو قرار دینا، روحانی پہلو کی اہمیت کو واضح کرتا ہے..... اس کا مطلب یہ ہے کہ روحانی پہلو کے اس تقاضے کو اگر نظر انداز کر دیا جائے اور انسان اللہ کی عبادت اور اس کے ذکر سے غافل ہو جائے، تو گویا اس نے اپنا مقصد تخلیق کھو دیا ہے۔ اس لئے نہ صرف عبادت بلکہ عبادت میں ذوق و شوق، خشوع و خضوع اور حضوری قلب عبادت کی جان ہے..... ایک حدیث کا جملہ ہے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اللہم انی أعوذ بک من قلب لا یخشع“ (مسند احمد ۱۶۷/۲۔ اے اللہ میں پناہ چاہتا ہوں اس دل سے جس میں خشوع و خضوع نہ ہو) یعنی عبادت الہی اور ذکر اللہ کے وقت دل پوری طرح پروردگار کی طرف جھکا رہے..... اس کا پورا پورا ادھیان رہے۔ اس طرح وہ عبادت و ذکر کی حلاوت کو اس طرح محسوس کرے گا جس طرح زبان خوش ذائقہ کھانے کی لذت کو محسوس کرتی ہے..... یہیں سے یہ بات بھی بطور ایک نکتہ کے سامنے آتی ہے کہ دل میں سوائے ایک ہی ذات کی ہو سکتی ہے..... ایک دل میں ایک ہی کی محبت سما سکتی ہے..... اس لئے یقیناً وہ ذات واحد و یکتا ہے..... وحدہ لا شریک ہے۔

وجود باطنی یا نفسی کا دوسرا پہلو اخلاقی پہلو ہے..... اس کا تقاضہ ہے کہ انسان ایک بااخلاق

زندگی گزارے، یعنی اپنی زندگی میں اخلاقی اصولوں کی پوری پوری پاسداری کرے..... قرآن مجید میں ہے

وَنَفْسٍ وَّ مَآسَوَاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَ تَقْوَاهَا قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا
اور اس کی (قسم) جس نے نفس کو درست بنایا پھر اس کی بدکرداری اور پرہیزگاری اس کو سمجھا دیا تو مراد کو پہنچ گیا وہ جس نے اس کو پاک کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے

(الشمس : ۷۰ - ۱۰)

اسے آلودہ کیا۔

وجود نفسی کا اخلاقی پہلو اور اس کے تقاضے اتنے اہم ہیں کہ دنیا کے آغاز سے انسان ان کو مشترکہ طور پر تسلیم کرتا چلا آ رہا ہے۔ مثلاً جھوٹ کا بُرا ہونا اور سچ کا اچھا ہونا، امانت اور بددیانتی کا فرق، ظلم اور انصاف، کہ انصاف کا پسندیدہ ہونا اور ظلم کا بُرا ہونا..... اسی طرح ہمدردی و محبت، اس کے مقابلے میں نفرت کو غلط سمجھنا، اور اس طرح کے بہت سے اخلاقی تقاضے ہیں کہ جن کو دنیا کے تمام انسان بلا لحاظ مذہب و ملت تسلیم کرتے ہیں..... پاس عہد، وفاداری، ایمانداری..... یہ وہ اخلاقی اصول ہیں جو پوری دنیا میں مسلم ہیں اور ہمارے باطنی اور نفسی وجود کا تقاضہ ہیں۔

باطنی وجود کا تیسرا پہلو ذہنی وجود ہے..... اس دنیا کا ایک اہم تقاضہ طبعی اور فطری ذوق کی تسکین ہے۔ انسان کی طبیعت اور اس کی فطرت کئی پہلو رکھتی ہے..... طبعی ذوق چاہتا ہے کہ پینے کا پانی صرف پیاس نہ بجھائے بلکہ وہ خوشگوار اور فرحت بخش بھی ہو..... خوراک صرف بھوک ہی نہ مٹائے بلکہ وہ خوش ذائقہ بھی ہو..... لباس صرف بدن ہی نہ ڈھانکے بلکہ وہ دیدہ زیب بھی ہو..... مکان صرف رہنے کی ضرورت کو ہی پورا نہ کرے بلکہ وہ حسین و جمیل بھی ہو..... انسان کا طبعی ذوق پھول میں رنگ اور خوشبو چاہتا ہے..... نظاروں میں حسن و جمال کا طلب گار ہوتا ہے..... آوازوں میں سر اور لے کی خواہش رکھتا ہے..... انسان کا طبعی ذوق کلام میں حکمت و دانائی کو پسند کرتا ہے..... یہ طبعی ذوق کوئی معمولی چیز نہیں ہے..... یہ خدا تعالیٰ کی تخلیق کا شاہکار ہے..... اور دیکھئے خدا اپنی مخلوق کا کتنا خیال رکھتا ہے..... اس نے انسان کو

بسانے کے • لئے جو دنیا بنائی وہ ایسی خوبصورت بنائی۔ یہاں رنگ اور خوشبو بھی ہے..... شفق اور آب جو بھی ہے..... چاند تارے، پھول، شبنم، یہاں نغمہ بھی ہے اور صبا بھی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کے اس طبعی ذوق کی اتنی پاسداری کی ہے کہ اس نے صرف وہ غذا ہی پیدا نہیں کی جس میں حیات بخش جوہر موجود ہو بلکہ طرح طرح کی خوش ذائقہ چیزوں کے انبار لگادئے ہیں۔

اگر جسم کی زندگی کے لئے ہو ضروری تھی تو اللہ تعالیٰ نے صرف ہو ای پیدا نہیں کی بلکہ باد صبا اور نسیم چمن کو بھی وجود بخشا.....

اس نے سننے کے لئے صرف کان ہی نہیں بنائے بلکہ قوت سماعت کے ساتھ ساتھ بلبل کا نغمہ اور کوئل کی کوک بھی عطا کی.....

اس نے دیکھنے کے لئے آنکھیں ہی نہیں بنائیں بلکہ اس طبعی ذوق کی تسکین کے لئے اچلتے چشموں اور آب رواں کے منظر، چمن، پھول، رنگ، قوس و قزح، سرسبز و شاداب منظر، بلند بالا پہاڑ اور ایسے ایسے خوبصورت مناظر جو انسان کے ذوق کو تسکین دے سکیں.....

علم انسان کی ضرورت ہے..... مگر اس خشک چیز کو اسلوب بیان کی چاشنی عطا کر دی..... تعمیل حکم نفس پر گراں تھی اسے حکمت کی روح سے مرغوب بنا دیا..... اسی طبعی ذوق کی تسکین کے لئے جو ہمارے باطنی وجود کے ذہنی پہلو کا ایک اہم تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ جنت کی بات کرتے ہیں تو کس طرح اس طبعی ذوق کو انگیزت کرتے ہیں۔ فرمایا.....

”مستقیوں سے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کے اوصاف یہ ہیں، اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اس کے باغوں کے پھل کبھی ختم نہ ہوں گے، اس کے درختوں کے سائے ہمیشہ رہیں گے، اس میں ایسے پانی کی نہریں ہوں گی جس میں بونہ ہوگی، ایسے دودھ کی نہریں ہوں گی جس کا مزہ نہ بدلے گا، اس میں ایسی شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لئے سر اسر لذت ہے، اس میں ایسے شہد کی نہریں ہیں جو حلاوت ہی حلاوت ہے اور ان کے لئے وہاں بھی پھل ہوں گے اور ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہوگی“ (محمد: ۱۵)

نبی ﷺ نے دنیا میں عورت اور خوشبو کو پسندیدہ فرما کر انسان کے طبعی ذوق کا اظہار

فرمایا ہے۔

غرض یہ کہ انسان کا ایک ظاہری جسمانی وجود ہے جس کے اپنے تقاضے ہیں..... دوسرا باطنی اور نفسی وجود ہے اس کے اپنے تقاضے ہیں..... اسلام نے مادیت اور روحانیت اور ان دونوں کے تقاضوں میں غضب کا توازن قائم کیا ہے، کہ نہ بدن کے تقاضے روح پر غالب آجائیں اور نہ صرف روحانیت جسم کے تقاضوں کو پامال کر دے..... اس طرح ترک دنیا کی اسلام میں اجازت نہیں ہے..... دراصل یہ دین انسان کی زندگی کو فطرت کے نظام کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔ اور اس طرح زندگی اور فطرت ایک کل بن جاتے ہیں جن میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ اسی لئے اس دین پر چلنے سے ایک متوازن شخصیت بنتی ہے جو اپنے نصب العین کی طرف اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ اللہ کے آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور آپ ﷺ کی تعلیم و تربیت میں اعلیٰ درجے کا تناسب اور توازن پایا جاتا ہے..... ہر چیز میں ایک اعتدال ہے جو اس عمل کو خوبصورتی عطا کرتا ہے۔ آپ ﷺ کی تعلیم میں جمال و کمال کا پہلو انتہائی نمایاں ہے۔

سیرت نبوی ﷺ کا ایک واقعہ آپ ﷺ کے اس اعتدال اور توازن کی بہترین مثال ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ آپ ﷺ کے تین صحابی اللہ کی عبادت کے ذوق و شوق میں یہ عہد کر لیتے ہیں..... ان میں سے ایک کہتا ہے کہ میں شادی نہیں کروں گا کیوں کہ شادی کر کے میں اپنا پورا وقت اللہ کی عبادت میں نہیں لگا سکوں گا اور بال بچوں کے جھنجھٹ میں پھنس جاؤں گا۔ دوسرے صحابی کہتے ہیں کہ میں ساری رات جاگ کر اللہ کی عبادت کیا کروں گا۔ تیسرے صحابی کہتے ہیں کہ میں پورے سال روزے رکھا کروں گا۔

آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوتا ہے تو آپ ﷺ ان کو بلا کر پوچھتے ہیں کہ کیا تم لوگوں نے ایسا ایسا کہا ہے؟ ان کا جواب ہاں میں پا کر رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں ”تمہارا میرے بارے میں کیا خیال ہے؟“ وہ عرض کرتے ہیں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں آپ ﷺ کی زندگی ہمارے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے تو شادی بیاہ بھی کیا ہے۔ میرے تو بال بچے بھی ہیں، میں رات کو سوتا بھی ہوں اور اللہ کی

عبادت بھی کرتا ہوں میں روزے رکھتا بھی ہوں اور نفلی روزے چھوڑ بھی دیتا ہوں۔

(مسند احمد حدیث ۱۳۵۶۸)

اس طرح آپ ﷺ نے اپنی تعلیم و تربیت کے ذریعے دین و دنیا میں اعتدال کا راستہ دکھایا اور یہ بھی بتا دیا کہ دنیا کا راستہ بھی دین سے ہو کر ہی گزرتا ہے..... دین کو پانے کے لئے دنیا کو چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ دنیا کو ٹھیک ٹھیک اللہ کی فضا کے مطابق برتنا اسی کا نام دین ہے

دین اور دنیا میں آپ ﷺ نے کتنا حسین تناسب اور توازن و اعتدال قائم کیا ہے، اس کا اندازہ آپ ﷺ کے اس مشہور اور باوزن ارشاد مبارک سے ہوتا ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”الدنيا مزودة الآخرة“ (۱) دنیا آخرت کی کھیتی ہے یعنی دنیا کا آخرت کیساتھ وہی تعلق ہے جو کھیت کا پیداوار کے ساتھ ہوتا ہے..... کھیت کے بغیر پیداوار نہیں ہو سکتی اور پیداوار نہ ہو تو کھیت کا کوئی مصرف نہیں ہے۔ دین اور دنیا کے اس متوازن رشتے کو الہی سے بہتر الفاظ میں کوئی کیا تعبیر کر سکتا ہے۔ اس طرح آپ ﷺ نے بتا دیا کہ دنیا دار العمل ہے..... عمل کی جگہ ہے عمل کے لئے ہے اور آخرت دار الجزاء ہے، بدلے کا مقام ہے۔ دنیا میں عمل کا معاوضہ اور پورا پورا بدلہ آخرت میں ملے گا۔ اس طرح آپ ﷺ نے مذہب سے ترک دنیا کے تصور کو ختم کر کے اس کو جہد و عمل کا میدان بنا دیا۔ قرآن پاک کی زبان میں یہ بھی اعلان ہوا کہ ”لِئْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَاسَعِي“ (النجم: ۹-۳) انسان کو وہی ملے گا جو اس نے کوشش کی ہے) تو اس سعی کا میدان یہی زمین کی دنیا ہے، جس میں عمل کے لئے انسان کو بھیجا گیا ہے اور انسان کو خود اپنے عمل کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے یہ بھی صاف صاف بتا دیا گیا کہ ”لا تزد وازرة وذر اخرة (الفاطر: ۱۸)۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا) یہ نہیں ہو گا کہ کرے کوئی اور بھگتے کوئی۔

آپ ﷺ کی گھریلو زندگی کا ایک اور منظر بھی آپ ﷺ کے اس توازن و اعتدال کا بوا

(۱) قال السخاوی فی ”المقاصد الحسنة“ : لم افق عليه مع إيراد الغزالي فی ”الإحياء“

عمدہ اظہار ہے..... ازواج مطہرات فرماتی ہیں کہ جب آپ ﷺ گھر میں تشریف لاتے تھے، تو آپ ﷺ اس طرح ہم میں گھل مل جاتے تھے جیسے ہم ہی میں سے ایک ہیں، الگ تھلگ ہو کر بیٹھ نہیں جاتے تھے، بلکہ گھر کے معاملات میں پوری دلچسپی لیتے تھے۔ گھر کے لوگوں کے غم اور خوشی میں شامل رہتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض گھریلو کام بھی انجام دینے میں گھر کے لوگوں کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ اس طرح آپ ﷺ بالکل عام آدمیوں کی طرح ایک گھریلو آدمی نظر آتے تھے لیکن جیسے ہی اذان کی آواز آتی تھی تو آپ ﷺ اس طرح ہم سے الگ ہو جاتے تھے اور نماز کے لئے تشریف لے جاتے تھے جیسے ہم سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

یہی عادت آپ ﷺ کی اللہ کی عبادت کے معاملے میں تھی۔ نفل روزوں کے معاملے میں آپ ﷺ کا معمول گھروالوں کی زبان سے ملتا ہے کہ کبھی کبھی نفلی روزے مسلسل رکھتے رہتے تھے اور کبھی چھوڑ دیتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ آپ ﷺ نفلی روزے رکھیں گے ہی نہیں..... خود آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ صوم داؤدی سب سے بہتر ہے کہ ایک دن روزہ رکھا جائے اور ایک دن روزہ چھوڑ دیا جائے۔

یہی حسن اعتدال آپ ﷺ کے معاملے میں نمایاں ہوتا ہے کہ اپنے ذاتی معاملات میں آنحضرت ﷺ کی نرمی اور عفو و درگزر کا یہ حال تھا کہ آپ ﷺ کے خادم خاص حضرت انسؓ اپنی زندگی بھر کا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ اپنے ذاتی معاملے میں آنحضرت ﷺ نے یہ کبھی نہیں فرمایا کہ تم نے یہ کیوں کیا اور یہ کیوں نہیں کیا؟ آپ ﷺ نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا، کسی کے ساتھ بدزبانی نہیں فرمائی۔ معلوم ہوتا تھا کہ رحمت و رافت کی پھواریں نبی رحمت ﷺ کے قلب مبارک سے شب و روز جاری و ساری رہتی ہیں..... لیکن حدود اللہ کے معاملہ میں آپ ﷺ کا طرز عمل ذاتی معاملات سے بالکل مختلف تھا۔ آپ ﷺ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ آپ ﷺ کے سامنے اللہ کی حدود کو پامال کیا جائے چنانچہ فتح مکہ کے موقعہ پر جب بڑے سے بڑے دشمن کی معافی کا اعلان ہو رہا تھا، سب سے پہلا مقدمہ چوری کے ایک معاملے کا آپ ﷺ کے سامنے آیا۔ مکہ کی ایک معزز خاتون جن کا نام بھی اتفاق سے فاطمہ تھا چوری کے معاملہ میں ملوث پائی گئیں اور لوگوں نے معاملے کی نزاکت کو دیکھتے

ہوئے آپ ﷺ کے محبوب حضرت زیدؓ رضی اللہ عنہ کو سفارش کے لئے آگے بڑھایا تو نبی ﷺ کا چہرہ مبارک متمتا اٹھا اور عدل و انصاف کے تقاضوں کا اظہار ان الفاظ میں ہوا کہ اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتیں تو ان کو بھی شرعی سزا ضرور دی جاتی، تم سے پہلی امتیں اسی لئے ہلاک ہوئیں کہ قانون کمزوروں پر چلتا تھا اور طاقتور کو چھوڑ دیا جاتا تھا۔

(ابن ماجہ، ابواب الحدود، الشفاعة فی الحدود)

توازن و اعتدال کی اس سے شاندار مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔

○ ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کی تعلیم کا تعلق انسانی زندگی کے ہر گوشے سے ہے۔ انسان کی زندگی کا بہت اہم پہلو وہ ہے جس کا تعلق آمدنی اور خرچ یعنی اقتصادیات سے ہے۔ جس طرح آپ ﷺ نے عبادات میں، معاملات میں توازن و اعتدال کی تعلیم دی، اسی طرح اقتصادیات کے معاملہ میں آپ ﷺ نے اعتدال و توازن قائم رکھنے کا جو طریقہ بتایا وہ ایک ایسی کلید ہے، جس کو خوشحالی کا راز کہہ سکتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”الاقتصاد فی النفقہ نصف المعیشة“ (مشکوٰۃ شریف ص: ۳۰ باب الحذر و التانی فی الامور رواہ عن البیہقی فی شعب الیمان۔ جس کو میانہ روی کے ساتھ خرچ کرنا آگیا اس کو عمدہ زندگی بسر کرنے کا نصف طریقہ ہاتھ آگیا)

اب اس اصول کو سامنے رکھ کر نتیجہ نکالئے کہ جس کو ہم خوشحالی کہتے ہیں وہ اصل میں آمدنی اور خرچ میں توازن و اعتدال کا نام ہے۔ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی، ایک گھر کا بجٹ ہو یا ایک ریاست کا، آمد و خرچ میں اعتدال و توازن نہ ہو تو قارون کا خزانہ بھی ناکافی رہتا ہے۔ نہ زندگی میں حسن پیدا ہوتا ہے اور نہ سکون میسر آتا ہے۔ اسی کو کفایت شعاری اور سلیقہ شعاری سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور آپ ﷺ نے اسی کی عام لوگوں کو تعلیم دی۔ آپ ﷺ کی پوری زندگی سلیقہ مندی کی شاندار مثال تھی۔ کپڑا اعلیٰ قسم کا ہو یا معمولی صاف ہوتا تھا اور بے قاعدہ کبھی نہ ہوتا تھا۔

اسی طرح آپ ﷺ نے خورد و نوش کے معاملے میں خود بھی توازن و اعتدال قائم رکھا اور دوسروں کو بھی یہی تعلیم دی۔ آپ ﷺ نے اچھے سے اچھا کھانا بھی تناول فرمایا، عمدہ سے

عمدہ غذا کی بھی استعمال فرمائیں اور موٹا جھوٹا بھی کھایا، لیکن ہر حال میں اعتدال کا دامن تھامے رکھا۔ حدیث میں ایک واقعہ اس سلسلے میں بڑا عجیب ملتا ہے جو آج کی دنیا کے لئے عبرت و نصیحت کا سامان فراہم کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی رئیس نے آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کی خدمت گزاری کے لئے اور علاج و دوا کے لئے اپنے طبیب خاص کو آپ ﷺ کی خدمت میں بھیجا..... شاہی طبیب ایک زمانہ تک آپ ﷺ کے پاس رہے مگر کوئی بیمار علاج کے لئے نہیں آیا تو انہوں نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر صورت حال بتائی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہم لوگ بیمار ہی کم ہوتے ہیں۔ طبیب نے وجہ پوچھی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہم لوگ بھوک کے بغیر کھاتے نہیں اور ابھی بھوک باقی ہوتی ہے کہ کھانا چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی نوعیت کا ارشاد ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کافر ممت آنت میں کھاتا ہے اور مومن ایک آنت میں

(بخاری شریف ۸۱۲/۲ عن ابن عمر رضی اللہ عنہ سلم شریف ۱۸۶/۲)

آج کی دنیا میں موٹاپا اور بہت سی نفسیاتی بیماریاں اسی کھانے پینے میں بے اعتدالی کا نتیجہ ہیں، جس سے ذہن اور جسم دونوں متاثر ہوتے ہیں۔ کھانے پینے کے علاوہ کام اور آرام کے معاملہ میں بے اعتدالی عام ہوتی جا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فطرت انسانی کے مطابق دن کے اوقات کام کے لئے اور رات کو آرام کے لئے بنایا ہے ”جعلنا الليل لباسا و جعلنا النهار معاشا (النبا: ۱۰، ۱۱)۔ رات آرام کے لئے بنائی گئی ہے اور دن بھاگ دوڑ اور حصولِ رزق کی جدوجہد کے واسطے) آج کا انسان جس کو فخر سے ماڈرن انسان کہا جاتا ہے رات کو جاگنا اور دن کو دیر تک سونا ان کے لئے فخر کی بات سمجھی جاتی ہے۔

یہی معاملہ نئی ایجادات کا ہے کہ جن چیزوں کو انسان نے اپنے آرام اور زندگی کے لطف کے لئے ایجاد کیا، بے اعتدالی کی وجہ سے وہی چیزیں اس کے لئے وبال جان بنتی جا رہی ہیں۔ ماحول کی آلودگی بڑے بڑے شہروں میں ہی نہیں، درمیانی درجوں کے قصبوں میں بھی ایک جان لیوا مسئلہ بن گئی ہے۔ یہاں تک کہ اس آلودگی نے پینے کے پانی کو بھی آلودہ کر دیا ہے، اور انسان صاف پانی کو ترس گیا ہے اور اپنے ہی ہاتھوں سے اس نے اپنے آپ کو اللہ کی

نعمت سے محروم کر لیا ہے۔

یہی حال اخلاقی بے اعتدالی کا ہے کہ انسان نے خود ساختہ معیار زندگی کو اپنی زندگی کا مقصود بنا لیا ہے..... ساری انسانی جدوجہد گاڑی، کوٹھی اور بینک بیلنس کے گرد گھومتی ہے۔ معاشرتی بے اعتدالی نے خاندانی معاملات میں بناوٹ اور دکھاوے کو ایسا فروغ دیا ہے کہ محبت، خلوص، سادگی جنس نایاب ہو کر رہ گئے ہیں۔

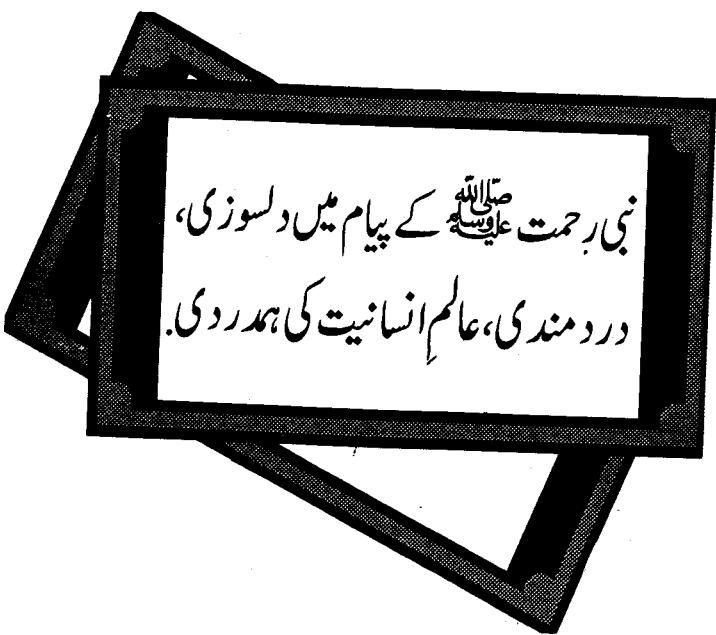
غرض معاملہ رہنے سہنے کا ہو، آمد و خرچ کا ہو، معاملات کا ہو، عبادات کا ہو یا خورد و نوش کا آپ ﷺ کی تعلیم و تربیت کے ہر گوشے میں بلا کا توازن اور حسن اعتدال پایا جاتا ہے، اور اعتدال ہی کا دوسرا نام حسن و لطافت ہے۔ یہی فطرت ہے کائنات کی اور یہی فطرت ہے انسان کی۔

فُطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ

اللہ کی اس فطرت کا اتباع کرو جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں، یہی ہے سیدھا دین۔ (الروم: ۳۰)

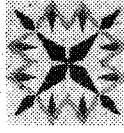


چوتھا خطبہ



نبی رحمت ﷺ کے پیام میں دلسوزی،
درد مندی، عالم انسانیت کی ہمدردی۔

” اسلام کا تصور یہ ہے کہ امن ایک مستقل اور بنیادی چیز ہے، جب کہ جنگ عارضی اور وقتی ہے جس کا مقصد امن و سلامتی کی حفاظت ہے یہ اجتماعی مفاد اور انسانیت کے تحفظ کے لئے ہے۔ جہاد، حق کی حفاظت کے لئے، اللہ کی رضا کے لئے سعی بلیغ ہے جس کا نقطہ عروج قتال فی سبیل اللہ ہے وہ بھی تمام آداب جنگ کے ساتھ۔ امن و جنگ کا یہ تصور انتہائی حقیقت پسندانہ اور منصفانہ ہے۔ حق و باطل کا معیار کیا ہے؟ اپنے رب کے فرمان کی تعمیل اور اس کا اقتدار و غلبہ اور اس سے باہر جو کچھ ہے باطل ہے، طاغوت ہے۔“



اسلام کی بنیاد اللہ کی وحدانیت پر ہے..... جس کا قدرتی اور لازمی نتیجہ نوع انسانی کی وحدت کا اقرار ہے..... یعنی یہ کہ تمام انسان ایک ہی ذات پاک وحدہ لا شریک کے پیدا کئے ہوئے ہیں، تو پھر رنگ و نسل اور زبان و وطن کے امتیازات کی اس سے زیادہ اور کیا حیثیت ہے کہ ان کو صرف تعارف اور پہچان کا ذریعہ سمجھا جائے..... انسانی عز و شرف میں ان کا کوئی دخل نہیں ہے..... آنحضرت ﷺ کے ذریعہ اللہ کی وحی کا یہ اعلان بار بار پڑھنے کے لائق ہے

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتَقْوَمُ
لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے خاندان اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے سے پہچان لئے جاؤ لیکن خدا کے یہاں زیادہ محترم اور شریف وہ ہے جو

(الحجرات : ۱۳)

زیادہ محتاط اور پرہیزگار ہو

انسانی وحدت اور اخوت و مساوات کے اس تصور کو زیادہ سے زیادہ موثر اور مضبوط و مستحکم کرنے کے لئے حضور ﷺ نے اس کو صرف ایک میٹھی بات اور دل پذیر و خوبصورت نصیحت ہی کا درجہ نہیں دیا بلکہ اپنے دلکش عمل کے تسلسل اور زبردست جدوجہد سے ایسے تمام احتمالات کا خاتمہ کر دیا جو کسی درجہ میں بھی وحدت انسانی کے رشتے پر اثر انداز ہو سکتے تھے۔

آپ ﷺ نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کی شادی مکہ کے زر خرید غلام زید بن حارث رضی اللہ عنہ سے کر کے حسب و نسب کے بجائے انسانی مساوات اور برابری کا عملی نمونہ پیش کر دیا۔ قریش کی ممتاز خاتون فاطمہ بنت ولید رضی اللہ عنہا کا نکاح ابوحنظفہ کے غلام اسماء رضی اللہ عنہ سے کر لیا۔

مدینہ کے انصار اپنی بیٹی دینے میں بہت سخت تھے..... قریش کے رئیس ہاشم نے جب مدینہ کی ایک خاتون سے نکاح کی درخواست کی تھی تو اس قبیلے نے اس شرط پر شادی کی اجازت دی تھی کہ ہماری بیٹی کبھی رخصت ہو کر مکہ نہ جائے گی..... مگر اسلام میں آنے کے بعد اسلام کی تعلیم اور آنحضرت ﷺ کی تربیت کے نتیجے میں اس قبیلے کا ذہن اتنا تبدیل ہو چکا تھا کہ ایک روز مشہور صحابی بلال رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی ﷺ میں اپنے بھائی کے لئے درخواست کی کہ لوگوں میں غلام ہوں، حبشی ہوں، بے مایہ ہوں۔ اس کے باوجود بھائی کی شادی کا خواہاں ہوں، تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے اس کہنے پر مدینے کے کئی معزز خاندانوں نے ان سے رشتہ قائم کرنے کی خود پیشکش کی۔

اس طرح انسانی مساوات اسلامی معاشرے میں صرف ایک دل خوش کن نظریہ ہی نہیں تھا بلکہ ٹھوس حقیقت بن گیا تھا۔

اس وحدت الہی اور وحدت انسانی کے عقیدے کا لازمی نتیجہ انسان دوستی، خیر خواہی، ہمدردی اور دلسوزی ہے..... اس کی بے شمار مثالیں آنحضرت ﷺ کی تعلیم میں اور عمل میں ملتی ہیں.....

نبوت کے ساتویں سال کی بات ہے کہ دشمنوں نے آنحضرت ﷺ کے خاندان کو پہاڑ کی ایک گھاٹی میں (جس کو شعب ابی طالب کہتے ہیں) محصور اور نظر بند کر دیا تھا۔ اور مکہ کے تمام قبیلوں نے مل کر یہ معاہدہ کیا تھا کہ بنی ہاشم کے خاندان کا اس وقت تک مکمل بائیکاٹ رکھا جائے جب تک یہ محمد ﷺ کو قتل کر دینے کے لئے ہمارے حوالے نہ کر دیں..... ان سے ہر طرح کا تعلق ختم کر دیا جائے..... یہاں تک کہ کھانے پینے کی بھی کوئی چیز ان تک نہ پہنچ سکے..... اس معاہدے کی تمام دفعات لکھ کر خانہ کعبہ کے دروازہ پر آویزاں کر دی گئی تھیں۔ اگر دیکھا جائے تو قبائلی نظام حکومت کے اعتبار سے یہ فیصلہ انتہائی سنگین اور بے رحمانہ تھا..... ایک طرف پورا مکہ تھا، دوسری طرف خاندان بنی ہاشم کے یہ بے آسرا اور بے یارو مددگار تھوڑے سے افراد تھے..... تھوڑے بہت دن نہیں، تین سال تک بنی ہاشم کا خاندان اس گھاٹی میں نظر بند رہا..... آپ ﷺ نے اور آپ ﷺ کے ساتھیوں نے اور خاندان کے

افراد نے درختوں کے پتے چبا چبا کر اور سوکھے چمڑے اہال اہال کر وقت گزارا..... معصوم بچے ہلکے ہلکے روتے تھے تو ان کی آہ و بکا سے دادی مکہ کا دل ہل جاتا تھا..... مگر قریش مکہ انتہائی بے دردی کے ساتھ اس پر قہقہے لگا کر گزر جاتے تھے۔

اب ذرا دل تھام کر سنئے کہ اس زمانہ میں قدرت نے مکہ والوں کو خشک سالی اور قحط میں مبتلا کر دیا..... بارش کے دور دور تک کہیں آٹا نہ تھے..... مکہ والے خود بھوک کی زد پر تھے کہ انہی حالات میں قریش کے سرکردہ شخص ابو سفیان آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ سے بارش کی دعا کے لئے درخواست کی۔

نبی رحمت ﷺ کا درد مند دل جس سے اللہ کے ہر بندہ کے لئے رحمت و رافیت کی دھاریں پھوٹتی تھیں، کہاں کسی کو مبتلائے مصیبت دیکھ سکتا تھا..... آپ ﷺ اسی وقت ہاتھ اٹھا کر اللہ کی بارگاہ میں ان مکہ والوں کے لئے دعا میں مصروف ہو گئے جنہوں نے آپ ﷺ سے اور آپ ﷺ کے خاندان والوں کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا تھا..... ایک لمحہ کے لئے بھی نہ آپ ﷺ نے سوچا اور نہ فرمایا کہ تم میرے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہو۔ دعا قبول ہوئی، خوب پانی برسا، مکہ سیراب ہو گیا، قحط سالی دور ہو گئی لیکن جس کی دعا کی برکت سے یہ سب کچھ ہوا تھا وہ اب بھی نظر بندی کے مصائب جھیل رہا تھا۔

سلام اس پر کہ جس نے خوں کے پیاسوں کو قبائیں دیں

سلام اس پر کہ جس نے گالیاں سن کے دعائیں دی

○ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے اور اس کا تعلق آنحضرت ﷺ کی مدینہ کی زندگی سے ہے..... یعنی جب آپ ﷺ اپنے وطن مکہ مکرمہ کو چھوڑ کر اللہ کے دین کے لئے مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تھے، تو نجد کے ایک سردار ثمامہ نے وہ غلہ جو نجد سے مکہ آتا تھا اس کو بند کر دیا، اور بند اس لئے کیا کہ چونکہ مکہ والے آنحضرت ﷺ کے دشمن ہیں اس لئے ان کو نجد کا غلہ نہیں ملے گا۔

رحمہم عالم ﷺ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ تڑپ گئے اور مکہ والوں کو غلہ بھیجنے کا حکم صادر فرمادیا۔

رحمت و راحت کا یہی انداز ہے جس نے آپ ﷺ کے دشمنوں کے سر آپ ﷺ کے قدموں میں جھکا دیئے..... یہ دراصل خدا کی وہ سچی محبت ہے جو بندوں کی خیر خواہی اور محبت سے گزرتی ہے.....

ارحموا من فی الارض یرحمکم من تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا فی السماء

(ترمذی ۲/۱۶۷ باب رَحْمَةُ النَّاسِ)

جنگی قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کی آپ ﷺ نے ایک نئی روایت کی بنیاد رکھی۔ آپ ﷺ نے ہدایت و نصیحت فرمائی ”فاستوصوا بهم خیرا“ (ترمذی، کتاب العلم باب الاستیلاء۔ ان سے اچھا معاملہ کرنا) ابو عزیز راوی ہیں کہ جب مجھے بدر سے قیدی بنا کر مدینہ لایا گیا تو مجھے انصار کے ایک خاندان میں جگہ ملی۔ اس گھر کے لوگ دونوں وقت اپنے کھانوں میں سے روٹی تو مجھے دیتے اور خود کھجور پرکتھا کرتے۔ یہ رسول ﷺ کی اس نصیحت کا اثر تھا، کسی کو کہیں سے روٹی کا ایک ٹکڑا بھی مل جاتا تھا تو مجھے لا کر دیتا، مجھے شرم محسوس ہوتی اور میں اسے لوٹا دیتا لیکن وہ زبردستی مجھے دیتا اور خود اسے ہاتھ بھی نہ لگاتا۔

اور فتح مکہ کا واقعہ تو سب کے سامنے ہی ہے کہ انسانی تاریخ میں اس طرح کے حسن سلوک کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

دنیا کی تاریخ تو یہی کہتی ہے کہ کوئی فاتح لشکر کسی بستی میں داخل ہوتا ہے تو وہاں کے باشندوں کی جان و مال اور آبرو پر بن آتی ہے۔

إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً
بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو وہاں خوزیزی کرتے ہیں لوٹ مار کرتے ہیں اور عزت والوں کو ذلیل کرتے ہیں۔
(النمل: ۳۴)

۲۰ رمضان المبارک ۸ھ (مطابق ۳۰-۶۲۹ء) آنحضرت ﷺ ایک فاتح کی

حیثیت سے آج اس بستی میں داخل ہو رہے تھے جہاں کے لوگوں نے آپ ﷺ کو تنگ کرنے میں، ہر طرح کی تکلیفیں پہچانے میں، آپ ﷺ کی بے آبروئی اور بے عزتی کرنے میں

کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ یہاں تک کہ مکہ کے سب قبیلوں نے مل کر آپ ﷺ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنالیا تھا اور ٹھیک اس رات میں جب حملہ آور آپ ﷺ کے مکان کو گھیرے ہوئے تھے آپ ﷺ اللہ کی مدد سے ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل گئے۔

جب آپ ﷺ نے مکہ چھوڑا تھا تو اللہ پر ایمان لانے والوں اور آپ ﷺ کو ماننے والوں کی ایک بہت مختصر سی تعداد تھی، مگر آج نبی اکرم ﷺ کی سرداری میں دس ہزار کا لشکر اسلام مکہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ راستے میں دو ہزار مسلمان اور شامل ہو گئے اور اس طرح یہ تعداد بارہ ہزار ہو چکی تھی۔

جب یہ لشکر مکہ سے چار کوس کے فاصلے پر ”مر الظہر ان“ میں خیمہ زن ہوا اور رات کو خیموں کے سامنے آگ روشن کی گئی تو دور دور تک آگ کے جلتے ہوئے الاؤ اس لشکر کی وسعت کا اعلان کر رہے تھے۔ چرواہوں نے مکہ میں اطلاع دی کہ ایک عظیم الشان لشکر مکہ کے باہر خیمہ زن ہے۔ یہ سن کر ابو سفیان، بدیل بن ورقہ اور حکیم بن حزام کو ساتھ لے کر نکلے، تو دور سے آگ روشن دیکھ کر یہ تینوں حیران رہ گئے کہ اتنا بڑا لشکر کہاں سے آگیا۔ یہ تینوں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ہمراہ نبی ﷺ کے خدمت میں پیش ہوئے اور اسلام کی پناہ میں آ گئے۔

اب ذرا دیکھئے کہ اسلام کا یہ لشکر جرار اور اس کا یہ عظیم سردار کس شان کے ساتھ مکہ میں داخل ہوتے ہیں، کہ آج فاتح مکہ کی گردن اکڑنے کی بجائے عاجزی سے جھکی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ ریش مبارک کجاوے کو چھو چھو جاتی تھی، آج اس فاتح کے سامنے ابو سفیان بھی تھے جنہوں نے بدر، احد اور خندق کی لڑائیوں میں اہم رول ادا کیا تھا، جو اسلام کے سخت ترین دشمن تھے، مگر ابو سفیان اسلام کی پناہ میں آ گئے اور رحمت عالم ﷺ کی طرف سے اعلان ہوتا ہے ”من دخل دار ابی سفیان فهو آمن“ (مسند احمد حدیث ۷۹۰۹)۔ جو ابو سفیان کے گھر داخل ہو گا اس کو لمان ہے)

اور ابو سفیان کی بیوی ہندہ بھی آپ ﷺ کے سامنے ہے جو احد کے معرکہ میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ گیت گا کر قریش کے سپاہیوں کا دل بڑھا رہی تھی، جس نے آپ ﷺ

کے محبوب چچا حضرت حمزہ کی لاش کی بے حرمتی کی تھی ان کے سینے کو چاک کر کے کلچہ چبانا چاہتی تھی، ان کے کان ناک کاٹ کر ہار بنا کر ڈالا تھا۔ فتح مکہ کے دن وہ بھی نقاب پہن کر آپ ﷺ کے سامنے آتی ہے۔ یہاں بھی اس کا لہجہ سخت ہے، آنحضرت ﷺ اس کو کچھ نہیں کہتے۔ آپ ﷺ کے عفو و کرم کو دیکھ کر وہ کہہ اٹھتی ہے:

”اے محمد (ﷺ) آج سے پہلے مجھے تمہارے خیمے سے زیادہ کسی خیمے سے نفرت نہیں تھی لیکن آج مجھے تمہارے خیمے سے زیادہ کسی کا خیمہ محبوب نہیں ہے“

یہ ہے آپ ﷺ کے کریمانہ اخلاق میں انسانی ہمدردی اور دل سوزی کا وہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جس نے آپ ﷺ کے بڑے سے بڑے دشمن کو آپ ﷺ کے سامنے جھکا کر رکھ دیا۔

اور سنئے! حضرت حمزہؓ کے قاتل وحشی مکہ فتح ہونے کے بعد بھاگ کر طائف چلے جاتے ہیں، طائف بھی فتح ہو جاتا ہے تو کہیں اور چلے جاتے ہیں، وہ جگہ بھی فتح ہو جاتی ہے اور وحشی کو کوئی پناہ نہیں ملتی۔ وہ بھی آکر آنحضرت ﷺ کے دامن عفو میں پناہ لیتے ہیں۔ حضور ﷺ ان کو دیکھ کر آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں، آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں مگر ان کے لئے بھی معافی کا اعلان ہوتا ہے، یہی وحشی ہیں جنہوں نے خلافت صدیقی کے زمانے میں جھوٹے مدعی نبوت میلہ کذاب کو قتل کیا تھا، فرمایا کرتے تھے: میں نے کفر کے زمانے میں بہترین مسلمان کا قتل کیا اور اسلام کے زمانے میں بدترین کافر کو مارا۔

ابھی نبی اکرم ﷺ کے کریمانہ اخلاق کی اور آپ ﷺ کے تحمل کی اور بھی کتنی ہی مثالیں ہیں۔ ابو جہل جیسے انسان کو کون نہیں جانتا، اس کے بیٹے عکرمہ منہ چھپائے پھرتے ہیں، مگر ان کی بیوی ام جمیلؓ اسلام قبول کر چکی تھیں، اور رسول اللہ کے عفو و کرم کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھیں، وہ خود یمن گئیں اور عکرمہ کو لے کر مدینہ پہنچتی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کو ام جمیلؓ کے آنے کی خبر ہوتی ہے تو ان کے خیر مقدم کے لئے اس تیزی سے اٹھتے ہیں کہ جسم مبارک پر چادر نہیں رہتی، جوش مسرت میں ارشاد فرماتے ہیں ”مرحبا بالراکب المهاجر“ (الحکم الکبیر للطبرانی جلد ۱/ حدیث نمبر ۱۰۲۱۔ اے مہاجر سوار تمہاری آمد مبارک ہو)۔

عکرمہ کو بھی معاف کر دیا جاتا ہے جس کے باپ نے مکہ میں آپ ﷺ کو سب سے زیادہ تکلیفیں دیں، جس نے آپ ﷺ کے جسم مبارک پر نجاستیں ڈالوائیں، جس نے نماز کی حالت میں آپ ﷺ پر حملہ کرنا چاہا، جس نے گلے میں چادر ڈال کر آپ ﷺ کا گلہ گھونٹنا چاہا، جس نے دار الندوة میں آپ ﷺ کے قتل کا مشورہ دیا تھا، جس نے بدر کا معرکہ برپا کیا تھا، آج اس کے بیٹے اور بہو کے ساتھ فاتح مکہ کا کریمانہ رویہ تو دیکھئے۔

تاریخ سے کہو کہ کوئی ایک مثال اس انسانیت، دلسوزی اور دردمندی کی اور اس اخلاق اور عفو و کرم کی لاکر تو دکھائے۔

○ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے قاتل بہار بن اسود جنہوں نے نہ صرف بہت رسول ﷺ کا قتل کیا، بلکہ کتنی ہی شرارتوں کا اسلام کے خلاف مرتکب ہو چکا تھا، مکہ کی فتح کے موقع پر یہ ان چند لوگوں میں سے ایک تھا جن کو قتل کرنے کا اعلان ہو چکا تھا، بہار بن اسود بھاگ کر ایران چلا جانا چاہتا تھا، مگر پھر کچھ سوچ کر سید ہادی نبوت پر حاضر ہوتا ہے۔ اور پھر اپنی خطاؤں کا اقرار کر کے معافی کا طلبگار ہوتا ہے۔ رحمت کا دروازہ اس کے لئے بھی کھل جاتا ہے، آنحضرت ﷺ اس کو معاف کر دیتے ہیں۔

صفوان بن امیہ نے جنگ بدر کے بعد عمیر بن وہب جمعی کو زہر میں بھیجی ہوئی تلوار دے کر نبی ﷺ کو قتل کرنے کے لئے بھیجا تھا اور کہا تھا کہ اگر تم اس مہم میں مارے گئے تو تمہارے اہل و عیال اور قرضے کا میں ذمہ دار ہوں۔ عمیر بن وہب اور صفوان بن امیہ دونوں کو معاف کر دیا جاتا ہے۔

اسی غزوہ مکہ کے موقع پر ۸۰ آدمیوں کا ایک دستہ پکڑا گیا جو جبل متعمم میں اتر کر آپ ﷺ کو قتل کرنا چاہتا تھا، آپ ﷺ کو خبر ہوئی تو فرمایا ان کو چھوڑ دو۔

مکہ میں داخل ہوتے وقت کسی پر جوش زبان سے یہ الفاظ بے ساختہ نکل گئے کہ ”الیوم یوم الملحمة“ (آج خوزیری کا دن ہے) رحمت عالم ﷺ کے کان میں یہ الفاظ پڑے تو پلٹ کر فرمایا ”الیوم یوم المرحمة“ (آج رحمت کا دن ہے)۔

آئیے فاتح مکہ کے کردار کا ایک اور مظہر تاریخ کی آنکھ سے دیکھتے چلیں..... یہ کعبہ کے

چاروں طرف صحن حرم ہے وہی صحن حرم جہاں آپ ﷺ کو گالیاں دی گئیں ، آپ ﷺ پر نجاست پھینکی گئی ، آپ ﷺ کے قتل کی تجویز منظور ہوئی آج وہ تمام لوگ فاتح مکہ کے سامنے ہیں ، ان میں وہ بھی ہیں جو اسلام کو مٹانے میں ایزی چوٹی کا زور لگا چکے تھے ، وہ بھی ہیں جو آپ ﷺ کو جھٹلایا کرتے تھے ، وہ بھی ہیں جو آپ ﷺ کی جہو میں اشعار کہتے تھے ، وہ بھی ہیں جو آپ ﷺ کو گالیاں دیا کرتے تھے ، وہ بھی ہیں جنہوں نے آپ ﷺ کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں ، وہ بھی ہیں جنہوں نے آپ ﷺ پر پتھر پھینکے تھے آپ ﷺ پر تلواریں چلائی تھیں ، وہ بھی ہیں جنہوں نے آپ ﷺ کے عزیزوں کا ناحق خون کیا تھا ، وہ بھی ہیں جو غریب اور بے کس مسلمانوں کو ستاتے تھے ، ان کو جلتی ریت پر لٹاتے تھے۔ دہکتے کوئلوں سے ان کے جسم داغنے تھے ، نیزوں کی انی سے ان کا بدن چھیدتے تھے۔ آج یہ سب مجرم سرنگوں سامنے تھے ، اور ان کے پیچھے دس ہزار خوں آشام تلواریں محمد ﷺ کے ایک اشارے کی منتظر تھیں۔ دفعتاً زبان مبارک کھلتی ہے ”قریش بتاؤ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں؟ جو اب ملتا ہے“ محمد ﷺ تم ہمارے شریف بھائی اور شریف بھتیجے ہو۔“ ارشاد ہوتا ہے ”آج میں وہی کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف علیہ السلام نے اپنے ظالم بھائیوں سے کہا تھا ”لا تشریب علیکم الیوم“ آج کے دن تم پر کوئی الزام نہیں۔“ اذہبوا فانتم الطلقاء“ جاؤ تم سبھی آزاد ہو (زاد المعاد ۳/۴۰۸)۔

اس پورے معرکے میں صرف چوبیس وہ لوگ قتل ہوئے جنہوں نے مقابلہ کیا تھا۔ جن میں میں آدمی قبیلہ بنی بکر کے تھے اور چار ہندیل سے تھے۔ دو مسلمان کرز بن جابر فہری اور خمیس بن خالد جماعت سے علیحدہ رہنے کی وجہ سے شہید ہو گئے۔

ایک بات قابل توجہ ہے کہ فتح مکہ کے موقعہ پر بہت سے قریش مسلمان ہو گئے تھے ، لیکن بہت سے اپنے کفر پر اور بت پرستی پر قائم رہے۔ کسی کو زبردستی اسلام میں داخل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

جنگ کا مقصد ہی امن و امان قائم کرنا اور فساد دور کرنا تھا ، اب حقیقت پر غور کرنے کے لئے کھلا اور آزاد ماحول تھا۔ ”من شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر“ (الکہف: ۲۹)۔ سو جس

کاجی چاہے ایمان لائے اور جس کاجی چاہے کافر رہے) دراصل جہاد اسلامی کا بنیادی مقصد ہی انسانی آزادی کو قائم رکھنا اور آزادی کے راستے میں آنے والی رکاوٹوں کا دور کرنا ہے۔

○ دل چاہتا ہے کہ ایک سوال آج کی دنیا سے کرتے چلیں کہ یہ دہشت گردی، انتہا پسندی اور بنیاد پرستی جیسی اصطلاحوں کی آڑ لے کر اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش، کیا آپ کی نظر میں انصاف ہے؟ اسلامی تاریخ کا کوئی صفحہ کھول کر بتائیے کہ اسلام نے کسی ظالم کے ظلم کی حمایت کی ہو، وہ تو ظلم مٹانے، فتنہ و فساد دور کرنے اور امن و امان قائم کرنے کے لئے دنیا میں آیا ہے۔

ایک سوال یہ بھی بڑا نازک ہے کہ بغاوت اور جنگِ آزادی میں حد فاصل کیا ہے؟ ہم نے اپنے ملک ہندوستان کو آزاد کرانے کی کوشش کی، انگریز اس کو بغاوت کہتے رہے، اس میں مرنے والوں کو باغی کہا جاتا رہا، اور ہم ان کو غازی اور شہید کہتے رہے۔ آزادی کیا ہے، کہاں سے شروع ہوتی ہے کہاں ختم ہوتی ہے..... اس کا پیمانہ کیا ہے.....؟

انصاف کے پیمانے جب بھی الگ الگ ہوں گے تو آپ کو اس طرح کی آوازیں سنائی دیں گی۔ اسلام کا نظام عدل تو یہ ہے کہ

لَا يَجْزِيَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ اَنْ لَا
تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی
اور کسی جماعت کی دشمنی تمہیں اس پر
آمادہ نہ کر دے کہ تم اس کے ساتھ
انصاف ہی نہ کرو۔ انصاف کرتے رہو
(المائدة : ۸)

کہ وہ تقویٰ سے بہت قریب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جتنے نبی اور رسول بھیجے اور اخیر میں حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا، ان سب کی، اور آپ ﷺ کی تشریف آوری کا واحد مقصد یہ رہا کہ وہ لوگوں کو بشارت دیں کہ اللہ کی فرماں برداری اور اس کی اطاعت گزاری کا انعام دنیا اور آخرت میں کیا ملتا ہے، اور وہ لوگوں کو ڈرائیں کہ نافرمانی کا انجام کیا بھگتنا پڑتا ہے۔ لوگوں کو خطرات اور نقصانات سے آگاہ کریں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر رحمت ہے کہ وہ اپنے رسولوں کو مبعوث کرتا ہے اور انسانوں کو عذاب سے بچانے کے لئے ان کو آگاہ کرتا ہے۔

اللہ کی رحمت کی یہی بھلک نبی رحمت ﷺ کے پیام میں ملتی ہے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ تمہارا حال یہ کہ تم دوڑ دوڑ کر آگ کے گڑھے میں گرنا چاہتے ہو اور میں تمہاری کمر پکڑ پکڑ کر تمہیں اس سے بچانا چاہتا ہوں۔ (ترمذی، باب مثل ابن آدم واجلہ والد)

طائف کا واقعہ عہد نبوت کا نہایت عبرت انگیز واقعہ ہے۔ طائف کے رئیس عبدیلیل اور اس کے خاندان نے نہ صرف آپ ﷺ کو پناہ نہیں دی بلکہ بازاری شیروں کو آپ ﷺ کے خلاف ابھارا۔ اوباشوں کا یہ گروہ طائف کے بڑے راستے پر دورویہ کھڑا ہو گیا، اور آپ ﷺ وہاں سے گزرے تو دونوں طرف سے پتھر برسائے شروع کر دیئے۔ یہاں تک کہ جسم پاک زخمی اور قدم مبارک خون آلود ہو گئے اور جوتیاں خون سے بھر گئیں۔ آپ ﷺ جب تھک کر اور نڈھال ہو کر بیٹھ جاتے تو ظالم آپ ﷺ کا بازو پکڑ کر کھڑا کر دیتے اور جب چلنے کی کوشش کرتے تو پھر اسی طرح پتھر برساتے، طائف کے اس دن کی روحانی اور جسمانی اذیتوں کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ نو سال کے بعد جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دریافت فرمایا کہ تمام عمر میں آپ ﷺ پر سب سے زیادہ سخت دن کون سا آیا تو آپ ﷺ نے طائف کے اسی دن کا ذکر فرمایا۔ لیکن طائف کے اس روز اسی حالت میں جب آپ ﷺ سخت زخمی تھے، آپ ﷺ کے محبوب ساتھی حضرت زید رضی اللہ عنہ نے بے تاب ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ ان بد بختوں کے لئے بد دعا کیوں نہیں کرتے، تو آپ ﷺ کے تیور بدل گئے اور روئے مبارک پر ناگواری کے آثار نمایاں ہو گئے۔ فرمایا ہرگز نہیں میں دنیا کے لئے رحمت بن کر آیا ہوں۔ اس کے بعد دیہ دعا فرمائی خدایا میری قوم کو سیدھا راستہ دکھا دے، یہ اپنے نفع نقصان اور برے بھلے کو نہیں پہچانتی۔ جس وقت زخمی حالت میں حضرت زید رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کو پیٹھ پر اٹھا کر آبادی سے باہر لے کر آئے شہر سے دور ایک باغ میں، جو باغ حبشی کے نام سے مشہور تھا اور جو مکہ کے رئیس ربیعہ کے بیٹوں عقبہ اور شیبہ کا تھا، حضرت زید نے زخموں کو دھویا، منہ پر پانی چھڑکا آپ ﷺ کو کچھ افادہ محسوس ہوا تو زبان اقدس پر یہ درد بھری دعا تھی.....

جس کو ابن ہشام نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔

یہ دعا اور اس کے الفاظ نبی ﷺ کی سیرت کے اس پہلو کو پورے طور پر اجاگر کرتے ہیں کہ ایک رسول اور دنیاوی قائدین میں بنیادی طور پر کتنا فرق ہوتا ہے۔ رسول نازک ترین لمحوں میں بھی انسانیت کی ہمدردی کے احساس سے خالی نہیں ہوتے اور اللہ کے ساتھ ان کا تعلق ہر حال میں مستحکم رہتا ہے۔ آپ ﷺ کی دعا کے الفاظ یہ ہیں:

” اَللّٰهُمَّ اِلَيْكَ اَشْكُو ضَعْفَ قُوَّتِي وَفَقْلَةَ حِيلَتِي وَاهْوَائِي عَلَي النَّاسِ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ اِلَى مَنْ تَكَلُّمِي اِلَى عَدُوِّ يَتَجَهَّمُنِي اَمْ اِلَى قَرِيْبٍ مَلَكْتَهُ اَمْرِي اِنْ لَمْ تَكُنْ سَاخِطًا عَلَيَّ فَلَا اُبَالِي غَيْرَ اَنْ عَافَيْتَكَ اَوْسَعُ لِي ، اَعُوْذُ بِنُوْرٍ وَجْهَكَ الْكَرِيْمُ الَّذِي اَصْأَتْ لَهُ السَّمَاوَاتُ وَاَشْرَقَتْ لَهُ الطُّلُمَاتُ وَصَلَحَ عَلَيْهِ اَمْرُ الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ اَنْ تَحُلَّ عَلَيَّ غَضَبُكَ وَ تَنْزِلَ عَلَيَّ سَخِطُكَ وَ لَكَ الْعُتْبَى حَتَّى تَرْضٰنِي وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِكَ .

(ابن ہشام ۲ / ۶۲)

تیرے بغیر نہیں۔

مشہور واقعہ ہے کہ آپ ﷺ نے ایک بوڑھی عورت کو دیکھا کہ اپنی طاقت سے زیادہ بوجھ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ غریب کی کمر بوجھ سے دوہری ہوئی جارہی تھی..... مگر کوئی اللہ کا بندہ اس کی مدد کے لئے آگے نہیں بڑھا۔ آگے بڑھے تو نبی رحمت ﷺ، اس کا بوجھ اٹھا کر لے چلے، آگے آگے بڑھیا پیچھے پیچھے آپ ﷺ سامان لے کر جا رہے تھے.....

بوڑھیا راستے میں باتیں کرتی رہی، اس نے سن رکھا تھا کہ محمد نام کے کوئی شخص ہیں، اور وہ ایسے ہیں ویسے ہیں، بوڑھیا کہتی رہی کہ تم اس سے دور رہنا سنا ہے بڑا جادو گر ہے، تم مجھے اچھے آدمی لگتے ہو۔ جب آپ ﷺ اس بوڑھیا کے گھر پہنچے، سامان اتار کر رکھا، بوڑھیا نے پوچھا بیٹا تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا! ماں! میرا نام محمد ہے۔

○ اور یہ واقعہ بھی تاریخ نے اپنے صفحات میں محفوظ کر لیا ہے کہ ایک روز آپ ﷺ کسی مکان کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ دیکھا ایک عورت جو کسی کی کنیز تھی اس کے سامنے گیہوں کا ڈھیر پڑا ہوا ہے۔ کمزوری اور بیماری کی وجہ سے اس کے کمزور ہاتھوں سے چٹکی بار بار چھوٹ جاتی ہے۔ ایک آہ بھرتی ہے اور پھر پینے میں لگ جاتی ہے۔ آپ ﷺ کا درد مند دل تڑپ اٹھا، آگے بڑھے، اس سے کہا کہ تم آرام کرو اور خود سارے گیہوں رحمت عالم ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے پیس کر اس غریب کی مدد کی اور ظالم آقا کے ظلم سے بچایا۔ اس طرح کے سینکڑوں ہزاروں واقعات نبی رحمت ﷺ کی دلسوزی، درد مندی اور عالم انسانیت کے ساتھ آپ ﷺ کی ہمدردی کے ناقابل فراموش ثبوت ہیں..... اور رب العالمین کی جانب سے آپ ﷺ کو دیئے ہوئے خطاب ”وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ“ کی صداقت کی علامت ہیں۔ آپ ﷺ کے رحمانہ و کریمانہ اخلاق صرف انسانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ اللہ کی تمام مخلوق حتیٰ کہ جانوروں تک کے لئے تھے۔ مشہور واقعہ ہے کہ کوئی صاحب آپ ﷺ کے پاس آئے تو ان کا اونٹ اپنی تھوٹی آپ کے سامنے رگڑنے لگا..... آپ ﷺ نے اونٹ کے مالک کو بلایا اور فرمایا کہ تمہارا اونٹ شکایت کر رہا ہے کہ تم اس سے زیادہ کام لیتے ہو اور کھانے کے لئے کم دیتے ہو (ترجمان النبی عن الطبرانی حدیث نمبر ۱۴۱۰)..... بلاوجہ کسی جانور کو مارنے اور ستانے سے آپ ﷺ نے منع فرمایا..... اصل بات یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں اللہ تعالیٰ صرف معبود ہی نہیں بلکہ ”محبوب“ بھی ہے، اور محبوب بھی وہ کہ اس کی محبت میں فنا ہو کر اس کی پیدا کردہ ساری مخلوق محبوب بن جائے، اور صرف زبان کی حد تک نہیں بلکہ اس کی مخلوق کے ساتھ ہمدردی کا وہ سلوک کیا جائے جو اس کی محبت کے دعوے کو سچا ثابت کر دکھائے..... اللہ پر ایمان اللہ کی ذات سے محبت کرنے کا دوسرا نام ہے لیکن خدا کی محبت کی یہ

راہ رسول کی محبت میں پھر رسول سے ان کے ساتھیوں (صحابہ) کی محبت میں اور اسی طرح درجہ بدرجہ عام مومنین اور انسانوں کی محبت میں پھر اس کی تمام مخلوقات کی محبت میں سے ہو کر گزرتی ہے اس لئے خدا کی محبت تک رسائی کے لئے ان محبتوں کو عبور کرنا ناگزیر ہے جو ان محبتوں سے گذر جاتا ہے وہ پروردگار کی محبت پا کر رہتا ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کی صورتیں مختلف ہیں ۔

رحمت عالم ﷺ کا ارشاد ہے :

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ : الْخَلْقُ عِيَالُ اللَّهِ فَأَحَبُّ الْخَلْقِ إِلَى اللَّهِ مَنْ أَحْسَنُ إِلَى عِيَالِهِ

حضرت انس اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے عیال نہیں، لیکن اس سے بڑھ کر اس کے لئے اس کی مخلوق ہے، تو اس کی تمام مخلوق میں اللہ کا سب سے زیادہ پیارا وہ ہے جس کی نظروں میں اس کی مخلوق سب سے پیاری ہو (جیسا کہ والدین کو سب سے پیارا وہ شخص معلوم ہوتا ہے جس کی نظروں میں اس کی اولاد سب سے پیاری ہو)

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان و فی الباب احادیث و صحاح ما یدل علی هذا المعنی)
(مشکوٰۃ باب الرحمة علی الخلق صفحہ ۴۲۵)

اللہ کی مخلوق میں انسان کو تو انسان سمجھے محبت ہونی ہی چاہئے کہ اسی انس و محبت کی وجہ سے اس کا نام ”انسان“ پڑا ہے۔

وما سمی الانسان الا لانسہ و ما القلب الا انه یتقلب

(انسان کو انسان کہتے ہی اس لئے ہیں کہ وہ سر تاپا انس ہی انس ہوتا ہے، اور قلب کا نام اسی لئے قلب ہے کہ وہ ہر وقت التلاطم رہتا ہے۔)

انسان کے علاوہ اللہ کی مخلوق میں جانوروں تک کے ساتھ اچھے سلوک کی تعلیم ہے۔

حدیث میں ہے :

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ.....
 قَالَ : رَسُولُ اللَّهِ ﷺ غَفِرَ لِمَرْأَةٍ
 مُؤْمِسَةً مَرَّتَ بِكَلْبٍ عَلَى رَأْسِ رَكْبَةٍ
 يَلْهَثُ كَادَ يَقْتُلُهُ الْعَطَشُ فَتَزَعَتْ
 خُفَّهَا فَأَوْثَقَتْهُ بِخِمَارِهَا فَتَزَعَتْ لَهُ مِنَ
 الْمَاءِ فَغَفِرَ لَهَا بِذَلِكَ ، قِيلَ إِنَّ لَنَا فِي
 الْبَهَائِمِ أَجْرًا ؟ قَالَ : فِي كُلِّ ذَاتِ
 كَبِدٍ رَطْبِيَّةٍ أَجْرٌ ، متفق عليه

(مشکوٰۃ باب فضل الصدقة صفحہ ۱۶۸)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ
 رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی
 عورت کی جو فاحشہ تھی صرف اتنی سے بات پر
 مغفرت فرمادی کہ اس کا گذر ایک پیاسے کتے پر ہوا
 جو ایک کنویں کی مینڈھ پر پیاس کی شدت سے زبان
 نکالے پڑا تھا اور دم توڑ رہا تھا، اس کو دیکھ کر عورت
 سے رہانہ گیا۔ بس فوراً اس نے اپنے سر کی اوڑھنی
 اتاری اور اسے پیر کا خف اس میں باندھ کر کنویں
 سے پانی نکالا اور اس کو پلا دیا بس دریائے رحمت جوش
 میں آگیا اور اسی بات پر اللہ تعالیٰ نے اس کو بخش دیا۔
 صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا یا رسول
 اللہ ﷺ جانوروں کے ساتھ ہمدردی کا بھی ہم کو
 ثواب ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں، جانور تو
 جانور ہر جاندار کے ساتھ ہمدردی کرنے پر تم کو
 ثواب ملے گا

جانوروں کے ساتھ بے رحمی کرنے پر کتنا عذاب ہوتا ہے اس کے بارے میں حدیث
 میں ہے:

ابن عمر رضی اللہ عنہ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ
 کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک
 عورت اتنی سی بات پر عذاب میں گرفتار ہوئی کہ
 اس نے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا، پھر نہ اس کو
 کھلایا پلایا اور نہ اس کو کھول کر چھوڑا کہ وہ چل پھر
 کر خود زمین کے کیڑے مکوڑے کھا لیتی۔

عَنْ ابْنِ عُمَرَ وَ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَا.....
 قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ غَذَبَتْ امْرَأَةٌ فِي
 هِرَّةٍ أَمْسَكَتْهَا حَتَّى مَاتَتْ مِنَ الْجُوعِ
 فَلَمْ تَكُنْ تَطْعَمُهَا وَلَا تُرْسِلُهَا فَتَأْكُلُ
 مِنْ خَشَاشِ الْأَرْضِ . متفق عليه
 (مشکوٰۃ باب فضل الصدقة صفحہ ۱۶۸)

جہاں پیاسے کتے کو پانی پلانے پر فاحشہ عورت کی بخشش ہو جائے..... اور بلی کو بھوکا پیاسا مارنے پر پکڑ ہو جائے..... جہاں محبت اور رحم دلی بنی ایمان قرار پائے وہاں بے رحمی اور تشدد کا کوئی تصور بھی ہو سکتا ہے؟

جانوروں کی قربانی اسی پروردگار عالم کا تو حکم ہے جس کی رحمت ہر آن ہر مخلوق پر بارش کی طرح برستی ہے..... حاکم کے حکم کی تعمیل بے رحمی ہے یا اطاعت اور اطاعت کا عین تقاضا۔

ڈاکٹر کو چیر پھاڑ کرتے دیکھ کر کیا ہم اسے ”بے رحم“ کہیں گے..... یا عین رحم دلی قرار دیا جائے گا..... ایک ہی قسم کا فعل حق کے ساتھ حق اور عین حق ہو جاتا ہے..... جان دینا اور جان لینا کہاں شہادت اور قربانی بن جاتا ہے اور کہاں خودکشی اور قتل کہلاتا ہے..... ایک ہی کام کہاں جرم اور کہاں قابل انعام..... معلوم ہوا فعل کی ظاہری شکل سے اس کا فیصلہ نہیں ہو تا بلکہ اس کا فیصلہ کیوں؟ کے جواب سے ہوتا ہے۔

O رحمت عالم کے تناظر میں اسلام کے تصور امن و جنگ (concept of war and peace) اور اسلام کے فوجداری قوانین کا مطالعہ نہایت بصیرت افروز ہو گا۔ اسلام میں انسانی جان کی انتہائی اہمیت ہے..... قرآن مجید میں حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں قابیل اور ہابیل کی دشمنی اور حسد اور آخر قابیل کے ہاتھوں اپنے بھائی ہابیل کے قتل کا واقعہ بیان کرتے ہوئے انسانی جان کی حرمت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

مِنْ أَجْلِ ذَٰلِكَ كَتَبْنَا عَلَىٰ بَنِي إِسْرَٰئِيلَ اٰیَۃًۭۙۤ اَنْۢ هُمْ لَاۤیَۡۤسِفُوۡۤاۤ اَنۡہٗۤ مِنْۢ قَتَلَۤ نَفْسًاۙ یَغۡتَیۡۤرُۡ نَفْسًاۙ وَّۤاَوْۤ لَۤیۡۤسَۤاۤ فِیۡ الْاَرۡضِ لَکَاۤئِمًاۙ قَتَلَ النَّاسَ جَمِیۡعًا وَّۤاَمِّنَاۤہَا لَکَاۤئِمًاۙ اَحۡیَا النَّاسَ جَمِیۡعًا

اسی وجہ سے بنی اسرائیل پر ہم نے یہ فرمان لکھ دیا تھا کہ جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کا قتل کر دیا، اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔

(المائدہ: ۳۲)

مگر قرآن مجید نے قتل و فساد کو قتل سے زیادہ سنگین جرم اور بڑی برائی قرار دیا ”وَالْفُتۡنَةُ

اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ“ (البقرة: ۱۹۱) کیوں کہ فتنہ و فساد کی تباہی اتنی زیادہ، اور عام ہوتی ہے کہ پوری پوری قومیں، پوری پوری بستیاں اور ملک تباہ و برباد ہو کر رہ جاتے ہیں..... اس لئے فتنہ و فساد برپا کرنے والوں کے لئے اسلام مؤثر ترین سزائیں تجویز کرتا ہے تاکہ سماج میں شر پسندی اور دہشت گردی کو پھیلنے کا موقع نہ ملے اور امن و امان قائم رہ سکے۔

وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ زَيْحِ فِيهَا فساد برپا نہ کرو جب کہ اس کی اصلاح اصْلَاحُهَا (الاعراف: ۵۶) ہو چکی ہو۔

اصلاح و درستی کا نکتاتی توازن ہے، جس کے قیام پر ہی حیات کے تمام مظاہر کا وجود موقوف ہے، اس کو درہم برہم مت کرو، فتنہ پردازی، سرکشی اور زیادتی اس توازن کو تباہ کر کے رکھ دیتے ہیں..... قیام عدل کے لئے یہ اعلیٰ تعمیر مقصد ہے کہ ظلم کو مٹایا جائے، ظالم کی سرکوبی کی جائے۔ انسانوں کی آزادی کا تحفظ کیا جائے، کمزوروں کی دادرسی کی جائے۔ اسلام کا تصور یہ ہے کہ امن ایک مستقل اور بنیادی چیز ہے..... جب کہ جنگ عارضی اور وقتی ہے جس کا مقصد امن و سلامتی کی حفاظت ہے یہ اجتماعی مفاد اور انسانیت کے تحفظ کے لئے ہے۔

جہاد حق کی حفاظت اور اللہ کی رضا کے لئے سعی بلیغ ہے، جس کا نقطہ عروج ”قال فی سبیل اللہ“ ہے وہ بھی تمام آداب جنگ کے ساتھ۔ امن و جنگ کا یہ تصور انتہائی حقیقت پسندانہ اور منصفانہ ہے..... حق و باطل کا معیار کیا ہے؟ اپنے رب کے فرمان کی تعمیل اور اس کا اقتدار و غلبہ، اور اس سے باہر جو کچھ ہے باطل ہے، طاغوت ہے.....

اسی طرح اسلام کا قانون فوجداری (Criminal Law) اسلام کے پورے نظام حیات کا ایک جزء ہے جو مجموعی طور پر مکمل سماجی انصاف اور معاشرتی امن کا ضامن ہے..... اس نظام میں جرائم کی سزائیں اس بنیاد پر تجویز کی گئی ہیں کہ اسلامی ریاست جرم کی تمام زہمیت کے سد باب کا انتظام کرے گی اور اس کے بعد بھی کوئی شخص قانون شکنی کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی طبیعت میں فساد ہے اور اپنی خواہش نفس کے لئے پورے معاشرے کو خطرے میں ڈال رہا ہے۔ خیر و صلاح اور رحمت و راحت کی حامل شریعت ایسے

خطرناک مجرم کو اس بات کا موقع دینا نہیں چاہتی کہ وہ سماج میں فتنہ و فساد پھیلانے اور عام آدمیوں کے امن و چین کو غارت کر دے۔

اس بات کو ہم ایک ڈاکٹر کی مثال سے اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ جس کا فرض ہوتا ہے کہ پورے جسم کو بچانے کے لئے بدن کے سڑے ہوئے حصے کو کاٹ کر الگ کر دے۔ اسی طرح معاشرے کے اخلاق اور امن و امان کی حفاظت ایک صالح اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے۔ انسانیت دوست لوگوں پر اس میں تعاون کرنا لازم ہے..... اسلام کے تصور جہاد اور اس کے قانون فوجداری کو کسی بھی طرح غیر اخلاقی اور غیر انسانی نہیں کہا جاسکتا۔ اس سے قانون فوجداری کو غیر مہذب قرار دینے والے اس صورت واقعہ کو سامنے رکھ کر فیصلہ نہیں کرتے کہ اسلام جرم کی جڑ کا قلع قمع کرنا چاہتا ہے..... اور سزا کا نفاذ وہ بھی حکومت و ریاست کے ذریعے اس وقت کرتا ہے، جب کہ جرم اور اس کی ترغیبات کے سارے راستے بند کر دیئے جائیں، لوگوں کے اخلاق اور کردار کو سنوارنے کے لئے مناسب ماحول تیار کر لیا جائے اور ان سارے انتظامات کے باوجود کوئی شخص قانون کو توڑتا ہے تو عدل و انصاف کے تمام تقاضے پورے ہو جانے پر وہ سزا کا مستحق ہوتا ہے..... اسلام کے قانون فوجداری نے یہ راستہ بند کر دیا ہے کہ کوئی شخص یا جماعت خود قانون ہاتھ میں لے کر سزائیں نافذ کرے۔

اسلامی قوانین اگرچہ اپنی جگہ بالکل معقول ہیں مگر ان کا نفاذ ایک خالص اسلامی معاشرہ کے لئے ہے..... اور جہاں تک غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کا معاملہ ہے اس میں اسلام نے انتہائی رواداری اور فیاضی کی تلقین کی ہے۔

مذہبی آزادی کی حفاظت کے لئے قرآن مجید کا اعلان ہے کہ ”لَا اِكْرَاهُ فِي الدِّينِ“ (البقرہ: ۲۵۶)۔ دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں ہے) ہر شخص اپنی مرضی سے جس مذہب کو اختیار کرنا چاہے کرے۔ حکم ہوا کہ.....

لَا تَسْبُوا الدِّينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ اے مسلمانو! یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں ان کو برا بھلا مت کہو (الانعام: ۱۰۸)

مسلمانوں کے خلاف سخت مذہبی عداوت کے باوجود مسلمانوں کو مروت اور بردباری کی

ہدایت کی جاتی ہے، کہ وہ دوسروں کی دشمنی سے مشتعل ہو کر عدل و انصاف کو کسی حال میں نہ چھوڑیں۔

لَا يَجْرِمُكُمْ شَنَاكَ قَوْمٍ عَلَىٰ أَنْ لَا تَعْدِلُوا إَعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ
اور کسی جماعت کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اس کے ساتھ انصاف ہی نہ کرو انصاف کرتے رہو (کہ) وہ تقویٰ سے بہت قریب ہے (المائدہ: ۸)

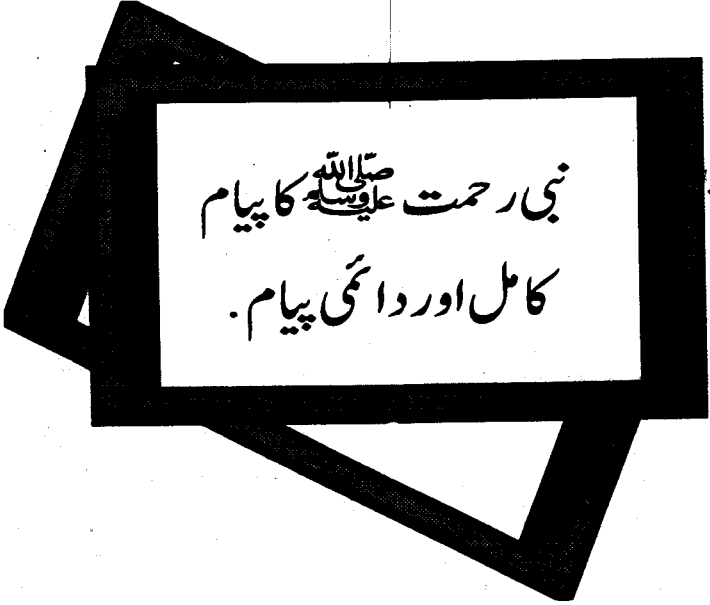
ناروا حملوں کا جواب بھی درگزر اور خیر خواہی سے دینے کی ہدایت کی گئی ہے..... اسلامی رواداری کا سب سے بڑا نشان یہ ہے کہ اس نے شرافت و عزت کا واحد معیار خدا ترسی اور پرہیز گاری کو بنا کر انسانی مساوات پر مہر تصدیق لگا دی ہے۔

یہ عالم انسانیت کی خوش نصیبی ہے کہ اس کے پاس نبی رحمت ﷺ کا پیغام اور آپ ﷺ کا عمل ایک مثالی نمونہ کے طور پر موجود ہے اور دنیا کے اندھیرے میں اجالا پھیلا رہا ہے۔

ہزار ہزار رحمتیں اور درود و سلام ہو اس نبی رحمت پر جنہوں نے انسانوں کو رواداری اور محبت کے پیغام سے آگاہ کیا، اور بہترین جزا عطا ہو آپ ﷺ کے اصحاب کو جنہوں نے آپ ﷺ کے پیغام کی جان سے بڑھ کر حفاظت کی، اور اس کو پوری صداقت کے ساتھ آنے والی نسلوں تک پہنچایا، ورنہ جس طرح پچھلے نبیوں علیہم السلام کی زندگی تاریخ کی گرد میں کھو کر رہ گئی اگر کہیں سیرت نبوی ﷺ پوری طرح محفوظ نہ ہوتی تو انسان خود ساختہ نظاموں میں بھٹکتا ہی رہتا۔

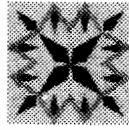


پانچواں خطبہ



نبی رحمت ﷺ کا پیام
کامل اور دائمی پیام۔

”سیرت کے واقعات دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ آپ ﷺ کے چاروں طرف مودی کمرے لگے ہوئے تھے جو آپ ﷺ کے ہر انداز اور ہر لفظ کو ریکارڈ کر رہے تھے، یہ مودی کمرے آپ ﷺ کے جاں نثار ساتھی اور آپ ﷺ کے عاشق صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے کہ ان صحابہ کا انتخاب بھی اسی طرح منجانب اللہ ہوا تھا جس طرح خود آپ ﷺ کا انتخاب اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا، کمرے ریکارڈ کر سکتے ہیں خود ان کا اپنا تاثر اور جذبہ نہیں ہوتا، صحابہ کرام ایسے جیتے جاگتے کمرے تھے جو محفوظ بھی کرتے تھے اور اس کا تاثر بھی قبول کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ کے انداز و ادائی وہ خود ایک چلتی پھرتی تصویر بن گئے اور پھر یہ تصویریں دنیا میں پھیلیں اور سیرت عمر ﷺ سے دنیا کا گوشہ گوشہ جگمگا اٹھا۔“



اللہ تعالیٰ کی ہدایت اس دنیا کے آغاز ہی سے مختلف پیغمبروں کے ذریعے انسانوں تک پہنچتی رہی ہے..... لیکن یہ حقیقت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے نبی یا رسول، اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت پہنچانے کے لئے منتخب اور مقرر فرمائے وہ.....

☆ یا تو کسی خاص قوم کے لئے تھے،

☆ یا کسی خاص علاقے کے لئے تھے،

☆ یا ایک مخصوص وقت کے لئے تھے،

یہی وجہ ہے کہ آج کوئی بھی آسمانی ہدایت اپنی اصل صورت میں بغیر کسی ملاوٹ یا تبدیلی کے دنیا میں موجود نہیں ہے۔ اور حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک کسی بھی نبی یا رسول کی مکمل زندگی کا مستند اور معتبر ریکارڈ اور ان کی کامل سیرت محفوظ نہیں ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ یہ کوئی اتفاقیہ بات نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی اس مشیت کا ایک حصہ ہے کہ صرف اسی کتاب ہدایت کو پوری طرح محفوظ رکھنے کا انتظام کیا جائے جو ہر اعتبار سے کامل اور تاقیامت باقی رہنے والی ہے۔

اور یہی وجہ نظر آتی ہے کہ جہاں قرآن مجید اپنے الفاظ اور معانی ہر اعتبار سے پوری طرح محفوظ ہے، اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی کی کوئی کوشش کسی زمانہ میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔

اسی طرح حضرت محمد ﷺ جو بلاشبہ نہ صرف خاتم الانبیاء ہیں، بلکہ منصب رسالت کی تکمیل کرنے والے بھی ہیں..... ان کی سیرت اور زندگی کے حالات حیرت انگیز حد تک

محفوظ اور مامون ہیں۔ آپ ﷺ کی حیات مبارکہ کے نہایت مخفی گوشے اور وہ باتیں جو عام حالات میں ناقابل التفات سمجھی جاتی ہیں وہ بھی پوری طرح تاریخ کے ریکارڈ میں موجود ہیں۔ مثلاً یہ بات کہ آپ ﷺ کے کس عمر میں کتنے بال سفید ہوئے یہ بات بھی صحابہؓ کی نگاہوں سے بچ نہیں سکی۔

آپ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلا ہوا ہر لفظ، آپ ﷺ کا اٹھایا ہوا ہر قدم، آپ ﷺ کی مسکراہٹ، آپ ﷺ کے چہرہ کی کیفیات، آپ ﷺ کی خوشی اور رنج کے جذبات، کوئی ادوا، کوئی انداز ایسا نہیں ہے جس کی حفاظت کے لئے تاریخ نے اپنا سینہ نہ کھول لیا ہو۔

ناچیز نے اپنی ایک تالیف ”معمار انسانیت“ میں جو سیرت پاک ہی پر لکھنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے..... مثال دیتے ہوئے اس کو یوں تعبیر کیا ہے کہ سیرت کے واقعات دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ آپ ﷺ کے چاروں طرف مودٰی کمرے لگے ہوئے تھے جو آپ ﷺ کے ہر انداز اور ہر لفظ کو ریکارڈ کر رہے تھے۔ یہ مودٰی کمرے آپ ﷺ کے جاں نثار ساتھی اور آپ ﷺ کے عاشق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے کہ ان صحابہ رضی اللہ عنہم کا انتخاب بھی اسی طرح مغناجب اللہ ہوا تھا جس طرح خود آپ ﷺ کا انتخاب اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا۔ کمرے ریکارڈ کر سکتے ہیں خود ان کا اپنا تاثر اور جذبہ نہیں ہوتا..... صحابہ کرام ایسے جیتے جاگتے کمرے تھے جو محفوظ بھی کرتے تھے اور اس کا تاثر بھی قبول کرتے تھے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کے انداز و ادائیگہ خود ایک چلتی پھرتی تصویر بن گئے تھے اور پھر یہ تصویریں دنیا میں پھیلیں اور سیرت محمدی (ﷺ) سے دنیا کا گوشہ گوشہ جگمگا اٹھا۔

یہ مخصوص انتظام اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ پیغام محمدی (ﷺ) کامل بھی ہے اور دائمی بھی..... چنانچہ یہ پیغام خود اپنی تکمیل کا دعویٰ کرتا ہے..... ارشاد ہے:

الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ
عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي (المائدة : ۳)

اس پیغام ہدایت کے مکمل ہونے کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی حصہ یا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو اس پیغام ہدایت کے دائرے سے باہر ہو اور جس کے لئے

رسول اللہ ﷺ کی سیرت میں نمونہ نہ ملتا ہو.....

عقائد..... عبادات..... معاملات..... معاشرت..... معیشت..... اخلاق..... تدبیر و سیاست..... غرض کوئی چھوٹے سے چھوٹا بڑے سے بڑا ایسا کوئی کام نہیں ہے جس کے لئے اس دین میں ہدایت اور سیرت میں نمونہ عمل موجود نہ ہو۔

گھر اور باہر کی زندگی میں آپ ﷺ کا کوئی عمل ایسا نہیں تھا جو لوگوں کے سامنے نہ آیا ہو۔ خود آپ ﷺ نے بھی اپنے گھر والوں، اپنے ساتھیوں اور دوسرے لوگوں سے برملا یہ فرمایا کہ جو کچھ تم مجھے کرتے ہوئے دیکھو یا کہتے ہوئے سنو، اس کو بلا تکلف دوسروں سے نقل کر دو..... جہاں آپ ﷺ کا یہ ارشاد آپ ﷺ کی صداقت کی کھلی دلیل ہے اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی زندگی کا ہر گوشہ دوسروں کے لئے نمونہ عمل ہے۔ پھر یہ کہ آپ ﷺ اپنے چاہنے والوں اور ماننے والوں کے درمیان ہی نہیں رہے بلکہ آپ ﷺ کی زندگی اپنے کٹر مخالفوں اور جانی دشمنوں کے درمیان گزری۔ آپ ﷺ کا بڑے سے بڑا مخالف بھی کبھی آپ ﷺ کے کردار پر انگلی نہیں اٹھا سکا، اور آپ ﷺ کی بے داغ زندگی میں کوئی داغ تلاش نہیں کر سکا، ایک روز کا واقعہ ہے کہ قریش کے بڑے بڑے رئیس جلسہ جمائے ہوئے تھے اور آپ ﷺ کا ذکر ہو رہا تھا..... نذر بن حارث جو قریش میں سب سے زیادہ سمجھدار، تجربہ کار اور جہاں دیدہ تھا اس نے قریش کے رئیسوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ محمد (ﷺ) تمہارے سامنے بچہ سے جوان ہوا، وہ تم میں سب سے زیادہ پسندیدہ اور امانت دار تھا، اور اب جبکہ اس کے بالوں میں سفیدی جھلک رہی ہے اور وہ اپنے آپ کو تمہارے سامنے اللہ کے رسول کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے، تو تم کہتے ہو کہ وہ ساجر ہے، کاہن ہے، شاعر ہے، مجنون ہے۔ خدا کی قسم میں نے اس کی باتیں سنی ہیں، ان میں سے کوئی بات بھی اس میں نہیں ہے۔ (بخاری ابن ہشام)

آنحضرت ﷺ کی صداقت کے ساتھ آپ ﷺ کی سیرت مکمل طور پر آئینے کی طرح لوگوں کے سامنے تھی جس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا گوشہ بھی لوگوں کی نگاہوں سے چھپا ہوا نہیں تھا۔

اب خیال فرمائیے کہ جو لوگ بھی کسی مذہب کو تسلیم کر کے اس میں داخل ہوں گے، وہ سب لوگ ایک ہی قسم کے تونہ ہوں گے۔ ان میں ریکس اور حاکم بھی ہوں گے، محکوم اور مطیع بھی ہوں گے، قاضی اور جج بھی ہوں گے۔ فوج کے سپہ سالار اور افسر بھی ہوں گے، غریب بھی ہوں گے اور دولت مند بھی ہوں گے، شب بیدار زاہد بھی ہوں گے اور دن کے سپاہی بھی، اہل و عیال والے بھی ہوں گے اور مجرد بھی، دوست احباب، تاجر، امام اور پیشوا، ان تمام مختلف قسم کے لوگوں کے لئے ایک کامل اور عملی نمونہ کی ضرورت ہے اور اسلام ان تمام قسم کے لوگوں کو نبی ﷺ کی پیروی کی دعوت دیتا ہے..... اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت محمد ﷺ کی زندگی کو انتہائی کامل اور مکمل ہونا چاہئے کہ وہ ہر طرح کے لوگوں کے لئے ہدایت کا چراغ بن سکے، اور ہر زمانے کے لوگ تاقیامت اس سے روشنی حاصل کر سکیں۔

انسان کے مختلف طبقوں کے علاوہ پھر خود انسان کی مختلف کیفیات اور جذبات ہیں..... چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، سنا، رونا، سوتا، جاگنا، سیکھنا سکھانا، جان دینا جان لینا، عبادت، کاروبار کتنے امور ہیں جن میں ہر قسم کی کوتاہی ہے، پھر قلب کے احساسات اور جذبات، پھر انسان کی مختلف صفات، عزم، استقلال، صبر و شکر، توکل، رضا، ایثار، تواضع، خاکساری غرض کتنے اخلاقی پہلو ہیں جو انسانوں کے اندر پائے جاتے ہیں ان سب کے لئے کامل اور دائمی نمونہ عمل جس کو اسلام پورے اعتماد اور جوش و خروش سے پیش کرتا ہے صرف اور صرف نبی ﷺ کی سیرت مبارکہ ہے۔

بڑی مشہور بات ہے کہ جب ایک یہودی نے نبی ﷺ کے ایک صحابی سے طنز اور استہزاء کے طور پر یہ کہا کہ تمہارا پیغمبر تم کو ہر چیز کی تعلیم دیتا ہے، اور تمہیں معمولی معمولی باتیں بھی سکھاتا ہے، اس یہودی کے اس طنز کو صحابی رسول نے اسی کے اوپر اٹھتے ہوئے جواب دیا تھا کہ ہاں ہمارے پیغمبر ہمیں ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں، یہاں تک کہ وہ ہمیں استنجے کے آداب اور طریقے بھی بتاتے ہیں۔ (معناہ فی الترمذی باب الاستنجاء بالحجارة)

اور یہ واقعہ ہے کہ اسلام اور سیرت محمدی ﷺ نے بہت چھوٹی چھوٹی اور نہایت معمولی باتوں کو بھی اپنی تعلیم کے دائرے سے باہر نہیں رکھا..... اور یہ اس کے کامل ہونے کی

واضح دلیل ہے، اور جو چیز کامل ہوتی ہے وہی دائمی اور باقی رہنے والی بھی ہوتی ہے۔ ناقص چیز اپنی مدت کے اعتبار سے بھی ناقص ہوتی ہے۔ اس لئے یہ بات بالکل بجا اور درست ہے کہ نبی رحمت ﷺ کا پیام، کامل بھی ہے اور دائمی بھی۔ اور جب یہ کامل اور دائمی ہے تو دنیا کو رہبری کے لئے کسی اور طرف دیکھنے کی حاجت بھی نہیں رہتی۔ اصل میں اس پیام کی بنیادیں فطرت کی گہرائی میں اتری ہوئی ہیں۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے توحید پرست ہے۔ اس کی فطرت میں شرکت کی گنجائش ہی نہیں اس لئے پیام محمدی ﷺ نے سب سے پہلے بے غبار توحید کا عقیدہ دلوں کے اندر اتارا، اور اس طرح ہر طرح کے انسانوں کو ایک ذات واحد کے ساتھ جوڑ دیا۔ ذات واحد جو اپنی ذات میں بھی یکتا اور بے مثال ہے اور اپنی اعلیٰ صفات میں بھی لاجواب ہے۔ قرآن نے توحید الہی کی ایک نکھری ہوئی صورت چند جملوں میں سامنے رکھ دی۔ فرمایا:

قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ
 اللَّهُ الصَّمَدُ
 لَمْ يَلِدْ
 وَلَمْ يُولَدْ
 وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ ۝
 (سورۃ الاخلاص)

اے پیغمبر ﷺ کہہ دو کہ اللہ ایک ہے
 اللہ بے نیاز ہے۔ تمام چیزیں اس کی نیت سے ہیں۔
 نہ اس نے کسی کو جنم دیا ہے۔ نہ کوئی اس کی اولاد ہو
 اور نہ وہ جنم جاتا ہے کہ کوئی اس کا باپ ہو
 اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے کہ نہ ان دو شوکار شہ
 قائم ہو سکے۔

ان چند جملوں سے اللہ اور بندے کے تعلق کی جتنی مادی تشبیہیں اور مثالیں ایجاد کی گئیں ان ساری غلط فہمیوں کو چند جملوں میں ختم کر دیا گیا کہ رب کا اپنے بندوں کے ساتھ جو تعلق ہے وہ باپ بیٹے اور ماں اولاد کا وقتی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ رب للعالمین ہے اور اس کا تعلق اپنی مخلوق کے ساتھ وقتی نہیں بلکہ ہمہ وقتی اور دائمی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور اس کی عظمت کو ظلمت سے الگ کر کے صفات کو ایک مستقل شکل دیدی گئی۔ نبی رحمت ﷺ کے پیام نے ان ساری غلط فہمیوں کا پردہ چاک کر دیا اور بتایا کہ صفات کو ذات سے الگ کر کے ذات کے کھوے

نکلے نہ کرو۔ تمام صفات اسی ایک ذات میں جمع ہیں۔ وہی خالق ہے، وہی قیوم ہے، وہی ممیت ہے، حیات، علم اور ارادہ سب اسی ذات میں جمع ہیں، صفات کے تعدد سے موصوف میں تعدد نہیں، وہی تمہارا اور تمہارے پہلے باپ داداؤں کا رب ہے۔

فَلْيَاذْكُوا اللَّهَ الْوَاحِدَ الرَّحْمَنَ إِلَهًا
تَذْكُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى
آپ کہئے اللہ (کہہ کر) پکارو یا رحمن (کہہ کر)
پکارو جس نام سے بھی پکارو اس کے اچھے ہی
(الاسراء: ۱۱۰) اچھے نام ہیں۔

پیام نبی رحمت ﷺ نے کائنات میں انسان کے اعلیٰ مقام کو نمایاں کیا۔ انسانوں کو بتایا کہ اس کائنات میں انسان اللہ کا نائب اور اس کا خلیفہ ہے۔ اللہ کی مخلوق میں سب سے افضل اور اشرف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات انسان کے لئے بنائی ہے، اس دنیا کی ساری چیزیں انسان کے لئے ہیں، البتہ انسان ان ساری چیزوں کے لئے نہیں ہے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ
فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (البقرة: ۳۰)
یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا
تھا کہ میں زمین پر نائب بنانے والا ہوں،
وہی ایسا ہے جس نے تمہیں زمین میں آباد کیا۔
(فاطر: ۳۹)

منصب خلافت کی وجہ سے انسان تمام مخلوقات پر برتر ہے۔
وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنیٓ آدَمَ (الاسراء: ۷۰) ہم نے اولاد آدم کو بزرگی عطا کی۔
جب انسان خلیفہ ہے اشرف و بزرگ ہے، تو یہ ساری دنیا اس کے لئے ہے، ہر چیز اس کی خادم ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِی
الْاَرْضِ (الحج: ۶۵)
کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے (جو کچھ زمین
میں ہے) تمہارے بس میں دیدیا ہے۔
مُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ
جَمِیْعًا (البقرة: ۲۹)
اسی نے تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے
بنایا ہے۔

یہ جانور بھی تمہاری خدمت اور فائدے کے لئے ہیں۔

وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَمَنْفَعٌ
(النحل: ۵) میں گرمی اور دوسرے فائدے ہیں اور جانور کو تمہارے لئے پیدا کیا، ان کے ادن

یہ دن رات کی گردشیں یہ چاند سورج ستارے سب انسان کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں
وَسَخَّرَ لَكُمْ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ
وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ
(النحل: ۱۲) حکم سے کام میں لگے ہوئے ہیں اور اس نے رات اور دن، سورج اور چاند کو تمہارے کام میں لگایا ہے اور ستارے اس کے

نبی رحمت ﷺ کے پیام نے انسان کو وہ بلندی عطا کی کہ اس کا سر ایک خدا کے سوا کسی
کے آگے نہیں جھک سکتا، اس کا ہاتھ ایک کے سوا کسی کے آگے نہیں پھیل سکتا۔
وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَهٌ
میں خدا ہے اور وہی آسمان میں خدا ہے اور وہی زمین

(الزخرف: ۸۴)

وَلَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ
(الفرقان: ۲) اس کی سلطنت میں کوئی شریک نہیں ہے۔

پیام رحمت کی اس تعلیم نے انسان کو خود شناسی اور اخلاقی قوت عطا کی اور اس کے بلند
مقام و منصب سے آگاہ کر کے تمام مخلوقات پر بلندی عطا کی اور یہیں سے خدا شناسی کا
راستہ ہموار کیا من عرف نفسه فقد عرف ربه .

(المقاصد الحسنة حدیث نمبر ۱۱۴۹ . ص: ۶۵۷)

پیام رحمت کا سب سے بڑا احسان انسانوں کے اوپر یہ ہے کہ اس نے اس پیام میں مذہب
کی ٹھیکداری کے تصور کو بالکل ختم کر دیا بندوں کو بندوں کی غلامی سے نجات دلا کر بندوں
کا تعلق براہ راست بغیر کسی واسطے کے ان کے مالک اور رب سے جوڑ دیا۔ عبد و معبود کے راز و
نیاز میں تیسرا کوئی دخل نہیں ہے یہاں کوئی کاہن، کوئی پریسٹ، کوئی پوپ اور کوئی
برہمن نہیں ہے ہر شخص جو مسلمان ہے نماز کا امام ہو سکتا ہے، قربانی کر سکتا ہے، نکاح کر
سکتا ہے، مذہب کے تمام مراسم بجالا سکتا ہے یہاں اعلان ہے :

أَدْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ (المؤمن : ۶۰) اے لوگو! (بلا واسطہ) مجھے پکارو میں تم کو جواب دوں گا۔

اپنے دل کے نذرانے، اپنی عقیدت بلا واسطہ پیش کریں..... یہاں کوئی خدا کا داہنا ہاتھ نہیں ہے کہ اس کے بغیر خدا کی عبادت نہ ہو سکے..... یہاں خدا کے کارخانے کی کوئی چیز کسی کے اختیار میں نہیں ہے..... کوئی ضرورت نہیں ہے کہ کسی انسان کو ”ارباب من دون اللہ“ مانا جائے..... مذہب کے نام سے آزاد انسانوں کو غلام بے دام بنائے رکھنے کا یہ سب سے بڑا ذریعہ ہے جس کو نبی رحمت ﷺ کے کامل اور دائمی پیغام نے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا۔ اس پیام رحمت نے ہمیشہ کے واسطے یہ بات طے کر دی کہ تمام انسان بحیثیت انسان کے برابر کا درجہ رکھتے ہیں..... حسب و نسب، مال و دولت، رنگ و روپ، شکل و صورت، قومیت اور وطنیت یہ سب مصنوعی اور بناوٹی چیزیں ہیں جس نے انسانوں کو طبقوں میں بانٹ دیا ہے..... احترامِ انسانیت میں ان کا کوئی دخل نہیں ہے..... فتح مکہ کے دن صحن حرم میں کھڑے ہو کر آپ ﷺ نے یہ تاریخی اعلان فرمایا کہ:

يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ إِنَّ اللَّهَ قَدْ أَذْهَبَ عَنْكُمْ نَحْوَةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَ تَعَظَّمَهَا بِالْأَبَاءِ، النَّاسُ مِنْ آدَمَ وَ آدَمُ مِنْ تَرَابٍ (زاد المعاد ۳ / ۴۰۷)

اے قریش کے لوگو! اب جاہلیت کا غرور اور نسب کا فخر خدا نے مٹا دیا، تمام انسان آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں۔

حجۃ الوداع کے مجمع میں آپ ﷺ کا یہ اعلان گونجا:

أَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى لِعَرَبِيٍّ وَلَا لِأَحْمَرٍ عَلَى أَسْوَدَ وَلَا لِأَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرٍ إِلَّا بِالتَّقْوَى (مسند احمد حدیث نمبر ۲۲۸۸۵)

عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر کوئی فضیلت نہیں ہے اور نہ ہی گورے کو کالے پر نہ کالے کو گورے پر ہاں تقویٰ کی بنا پر کسی کو کسی پر فضیلت حاصل ہو سکتی ہے۔

مصنوعی اور نقلی فرق کو ختم کرنے کے ساتھ انسان اور انسان کے ”اصلی فرق“ کو بھی واضح فرمادیا کہ انسان اور انسان میں فرق صرف ”عمل“ کا ہے..... ایک وہ انسان ہے جو اپنے

مالک کا فرماں بردار ہے، متقی اور پرہیزگار ہے، گناہوں سے بچتا ہے، بری باتوں سے دور رہتا ہے..... یہ انسان قابلِ قدر ہے..... دوسرا فرمان ہے، بدکار ہے، برے کام کرتا ہے..... یہ انسان عزت کے قابل نہیں ہے..... چاہے مالدار ہو، چاہے کسی خاندان کا ہو، چاہے اس کا رنگ کچھ بھی ہو۔ فرمایا :

إِنَّ اللَّهَ قَدْ أَذْهَبَ عَنْكُمْ عُبْيَةَ
الْجَاهِلِيَّةِ وَتَعَاضَمَهَا بِأَبَائِهَا فَالنَّاسُ
رَجُلَانِ، رَجُلٌ بَرٌّ تَقِيٌّ كَرِيمٌ عَلَى النَّاسِ،
وَفَاجِرٌ شَقِيٌّ هَيْنَ عَلَى اللَّهِ، وَالنَّاسُ
بَنُو آدَمَ وَخَلَقَ اللَّهُ آدَمَ مِنَ التُّرَابِ،
(ترمذی تفسیر سورۃ الحجرات)

خدا نے جاہلیت کے زمانے کے غرور اور نسب
کے فخر کو مٹا دیا انسان دو قسم کے ہیں یا تو وہ متقی
ایمان دار ہے اور لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ
کرنے والا یا گنہگار بد بخت ہے اور اللہ کے نزدیک
معمولی و ذلیل۔ تمام انسان آدم کے بیٹے ہیں اور
اللہ تعالیٰ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا۔

پھر یہ برادری، قبیلے، خاندان، زبانوں کا فرق، رنگ کا فرق کیوں؟ یہ صرف پہچان کے
لئے ہے..... ان کی وجہ سے انسانوں اور انسانوں کے درمیان کوئی حقیقی اور جوہری فرق
نہیں ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ
وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ
لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ
(الحجرات : ۱۳)

اے انسانو! تم سب کو خدا نے ایک ہی مرد و
عورت سے پیدا کیا۔ اور تم کو قبیلہ اور خاندان
میں صرف اس لئے تقسیم کیا تاکہ ایک
دوسرے کو پہچان سکو خدا کے نزدیک شریف

وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو۔

نبی رحمت ﷺ کی تعلیم نے اور آپ ﷺ کے دائمی پیام نے ایک ایسے مسئلہ کو آسانی
کے ساتھ حل کر دکھایا، جس میں دنیا کا بہت بڑا حصہ الجھا رہا ہے..... آپ ﷺ نے اس
الجھن کو اس طرح سلجھایا کہ وہ ہمیشہ کے واسطے ایک طے شدہ مسئلہ بن گیا۔

مسئلہ یہ تھا کہ خیر اور شر اچھائی اور برائی اس کا خالق ایک ہے یا خیر کا خالق کوئی اور، اور
شر کا خالق کوئی دوسرا ہے۔ یعنی دو ہستیاں ہیں، ایک ہستی خیر کی خالق اور دوسری شر کی

خالق ہے۔

الجہنم یہ ہوتی تھی کہ خیر و شر کا منبع ایک ہی ہو، یہ کیسے ممکن ہے یعنی ایک ہی ہستی شر اور خیر دونوں کی خالق کیسے ہو سکتی ہے۔

نبی رحمت ﷺ کے پیام نے بتایا کہ کوئی چیز اپنی اصل کے اعتبار سے نہ خیر ہے نہ شر ہے، نہ بُری ہے نہ بھلی ہے، بلکہ انسانوں کے صحیح یا غلط استعمال سے وہ اچھی یا بُری بن جاتی ہے..... آگ سے کھانا بھی پکتا ہے انجن بھی چلتے ہیں غریب آدمی ہاتھ بھی تاپتا ہے یہ آگ کے خیر کا پہلو ہے۔

آگ کسی غریب کا گھر جلادے یہ آگ کا شر ہے۔

تاریکی اور اندھیرا نہ خیر ہے نہ شر..... اندھیرے میں چوری کرو تو شر ہے، اندھیرے میں عبادت کرو تو یہ اندھیرا خیر ہے..... چیز ایک ہے اس کے استعمال کرنے والے دل و دماغ دو ہیں یہ انسان کا اپنا زاویہ نظر ہے جو کسی چیز میں خیر یا شر دیکھتا ہے..... ہدایت اور گمراہی کا ابتدائی محرک خود انسان ہوتا ہے انسان نے فسق کیا، فساد کیا، کفر کیا، اس کے نتیجے میں ضلالت و گمراہی آئی، ایسا نہیں ہے کہ ضلالت و گمراہی کے نتیجے میں فسق و فساد آیا..... صحیح راستے پر چلے تو ہدایت ہوئی غلط راہ پر چلے تو ضلالت ہوئی..... اس لئے خیر و شر کو دو چیزیں سمجھ کر دو خدا ماننے کی ضرورت نہیں بلکہ خدا ایک ہے جو ان دونوں کا خالق ہے۔

فَاللّٰهُمَّاهَا فَجُورَهَا وَتَقْوَاهَا قَدْ أَفْلَحَ مَنْ
كَارَى الْهَامَ كَرَدَى هُوَ تَوْجَسَ نَاسَ (نَفْس)
زَكَّاهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا
(الشمس : ۸، ۹، ۱۰)
کو مٹی میں ملا دیا وہ ناکام ہوا۔

نبی رحمت ﷺ نے دین کا ایک کامل اور صحیح تصور دیا اور یہ بتایا کہ دین دنیا سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ دین کی راہ دنیا سے ہو کر گزرتی ہے..... اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق دنیا کے کام انجام دینا بھی دین ہے، یعنی جس کو تم دنیا داری سمجھتے ہو اگر اس کو اپنے رب کے بتائے ہوئے طریقے پر کرو گے تو وہی دین داری

بن جائے گی..... دوست، احباب، اولاد، ماں، باپ، قوم و ملک، خود اپنی مدد آپ کرنا، معاش کی فکر، اولاد کی پرورش، اللہ کے حکم کے مطابق ان حقوق و فرائض کو بخوبی انجام دینا صحیح دینداری ہے..... عزلت نشینی، گوشہ گیری، کسی غار یا پہاڑ کی کھوہ میں بیٹھ کر خدا کو یاد کرنا اور اللہ کی عائد کردہ ذمہ داریوں سے دور بھاگنا کوئی دینداری نہیں۔

نبی رحمت ﷺ نے دین کے اس صحیح تصور کو اپنی پوری زندگی کے ایک ایک حصہ سے اتنا واضح اور روشن کر دیا کہ اب اس میں کسی کمی یا زیادتی کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔

نبی رحمت ﷺ کے کامل اور دائمی ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ عقیدے سے لے کر عبادات، معاملات، اخلاق ان میں سے کوئی حصہ ایسا نہیں جو دین کے دائرے سے باہر ہو۔ عقیدے کا تعلق ایمانیات کے ساتھ ہے جو فکر و نظر کو صحیح رخ دیتا ہے اور اس کی بنیاد پر عمل کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔

عبادت کا تعلق براہ راست اللہ تعالیٰ سے ہے جس میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج بندگی کے تمام طریقے اور ان کے آداب اور ان کی شرطیں سب شامل ہیں۔

معاملات کا تعلق سیاست، حکومت، معاشرت کے قوانین، معاشیات، آپس کا لین دین ان سب چیزوں کے ساتھ ہے۔

اخلاق جن کا تعلق انسان کے باہمی تعلقات اور انسان کے کردار اور دل کی کیفیات کے ساتھ ہے..... ان سب چیزوں کو ملا کر ایک ایسے مکمل نظام کا نقشہ ابھرتا ہے جو انسان کو دنیا اور آخرت کی کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے..... اس طرح نبی رحمت ﷺ کا پیام رحمت کامل بھی ہے، اور ہمیشہ باقی رہنے والا بھی..... انسانیت کل بھی اس کی محتاج تھی اور آج بھی اسی کی محتاج ہے.....

ازل کی صبح سے پہلے تو آفتاب منیر
تو ماہتاب درخشاں ابد کی شام کے بعد

یادداشت

اس کتاب سے

۹۹ تمام عالم کے لیے بلکہ عالمین کے لیے یعنی جتنے بھی عالم ہیں ان سب کے لیے وہی ذات باعثِ رحمت ہوگی جس نے دنیا والوں کی بھلائی، خیر خواہی، اُن کی ترقی اور اُن کی فلاح اور صلاح کے لیے اپنی پوری زندگی کو وقف کر دیا ہو، جس نے زندگی کے ایک گوشے میں نہیں بلکہ انسانوں کی پوری زندگی میں ایسا عظیم انقلاب برپا کیا ہو کہ اس سے بڑھ کر کسی اور انقلاب کا تصور بھی نہ ہو سکے، جس نے نہ صرف دلوں کو پاک اور رُوحوں کو روشن کیا ہو بلکہ عقل و خرد کی گتھیوں کو بھی اپنے ماتنِ حکمت سے سلجھادیا ہو، جس نے بندے کا تعلق خدا سے جوڑا ہو، اور دنیا و آخرت دونوں جہاں کی کامیابی کا نہ صرف یہ راستہ بتایا ہو بلکہ اُس پر خود عمل کر کے ایک مثالی نمونہ اور اعلیٰ درجہ کا اُسوۂ حسنہ، دنیا کے سامنے رکھ دیا ہو، جس کی تعلیم نے جنگِ بدل اور خونِ انسانی میں ڈوبی ہوئی دنیا کو امن کا راستہ دکھایا ہو، جس نے غربی اور امیری، جوانی اور بڑھاپے، فیری اور بادشاہی، غم اور مسرت، رنج و راحت ہر ہر مقام پر انسان کی رہبری کی ہو، جس کی تعلیم نے تہذیب و تمدن کی اُس بلندی کو چھوا ہو کہ اُس سے زیادہ بلندی کا تصور نہ ہو سکتا ہو، جس نے غلاموں کو حکمرانی، حکمرانوں کو جہاں بانی سکھائی ہو، جس نے علم و معرفت کے اُن خزانوں تک عالمِ انسانیت کو پہنچایا ہو، جن سے انسان آج تک بے خبر تھا، جس کے اخلاق نے خود غرضی کو درد مندی میں، نفرت کو محبت میں ترقی دیتی کو اخوت میں بدل دیا ہو، جس نے بتلایا ہو کہ جانی دشمن کس طرح جگری دوست بن جاتا ہے، جس کے صدق، امانت، صبر اور خاکساری نے انسانیت کا رتبہ آسمان سے بھی بلند کر دیا ہو، جس نے قوموں کی بے گامی کو یکجا گت سے، رنگوں کے اختلاف کو اخوت سے، زبانوں کے فرق کو محبت سے بدل دیا ہو اور سب کو ایک کلمہ جامع اور ایک مرکز سے اس طرح جوڑ دیا ہو کہ عالمِ انسانیت ایک خاندان کی صورت نظر آنے لگے۔ وہ ذاتِ اقدس جو ان صفات سے متصف ہو، اُسی کا لقب رحمت اللطیفین ہو سکتا ہے اور بلاشبہ وہ ہیں سرورِ کونین صَلَّی اللہ علیہ وسلم۔ ۶۶

(مفتِ فضیل الرحمن جلال عثمانی)